قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۵ فروری ۱۹۹۲ء شمارہ ۲

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

لمعات (ربو)	ادارہ	۲
وحی صرف قرآن میں ہے۔	محمد عمر دراز	۸
ازلی و ابدی روشنی	ثریا عندلیب	۱۶
فکرِ قرآنی کا سفر	قاسم نوری	۱۹
قرآن کے حقوقِ اشاعت	عبداللہ ثانی	۳۱
تعزیت	شکیل عثمانی	۳۵
بے خبر تو جوہرِ آئینہ ایام ہے	صلاح الدین اکبر	۳۷
حقائق و عبر	ادارہ	۴۷
اُٹھ کہ پھر سے خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں	بشیر احمد عابد	۴۹
ناقابلِ فراموش حقیقتیں	ادارہ	۵۷
موجودہ انسان	محمد ارشاد	۶۰
وزیرِ اعظم کے نام	اعزاز الدین احمد خان	۶۲
بچوں کا صفحہ	ادارہ	۷۷

لمعات

ربٰو

سود سے متعلق ۲۲ قوانین کے خلاف دائر کی گئی ۱۱۵ درخواستوں کو نمٹاتے ہوئے، وفاقی شرعی عدالت، اسلام آباد نے ۱۴، نومبر ۱۹۹۱ء کو اپنا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے قرار دیا کہ

"سود محض سادہ زیادتی کا نام نہیں ہے بلکہ شریعت میں یہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے ورنہ ایک طرح کا اضافہ تو بیع (فروخت) میں بھی ہوتا ہے، جسے اصطلاحاً منافع کہا جاتا ہے جب کہ ربا وہ معاوضہ ہے جو ادائیگی کی مدت کے عوض ادا کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ مدت قیمتی مال کی شکل میں نہیں ہوتی، اس لئے اس کی واپسی کو خلافِ قانون قرار دیا گیا ہے، خواہ وہ سرمایہ ہو یا کوئی اور چیز۔ بالفاظِ دیگر جب ایک طرف سرمایہ ہو اور دوسری طرف رعایتی مدت یا قرض کی واپسی کو مؤخر کرنے کا مطالبہ، اس صورت میں جو "منافع" طے کیا جائے، اسے ربا کہتے ہیں۔ تجارتی سرگرمیوں اور قرض کے لین دین کی ان مختلف صورتوں کے بغور مطالعہ سے، جو رسولِ اکرمؐ کے زمانہ میں عربوں میں مروّج تھیں، پتہ چلتا ہے کہ ایسا لین دین جس میں راس المال پر زیادتی یا اضافہ، جو مدت کے حوالے سے ادا کیا جاتا تھا اور جس کی ادائیگی کی بابت پیشگی شرط طے کر لی جاتی تھی، ربا کہلاتا تھا۔ پس جس لین دین میں بھی مذکورہ بالا عناصر پائے جائیں، وہ ربا ہے اور اس طرح کی کوئی فروخت، لین دین یا قرض، خواہ وہ نقدی کی صورت میں ہو یا جنس کی شکل میں، ربا کا کاروبار ہے جسے دارالاسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر مسلم فقہاء کا اجماع ہے۔"

قرآن کی رُو سے ربٰو کی تعریف کرتے ہوئے علامہ غلام احمد پرویزؒ نے کہا تھا کہ ربٰو سود ہی کا نام نہیں، یہ درحقیقت

ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔ لہٰذا، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربٰو کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کر لیں۔ بجائے اس کے کہ ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہو گیا ہے۔ علامہ صاحب کا مکمل بیان قارئین کے استفادہ کے لئے پیش خدمت ہے۔

قرآن کی رُو سے ربٰو کی تعریف

قرآن کی رُو سے ربٰو کی جامع اور مانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۹ میں آئے ہیں۔ یعنی:۔

وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ۔

اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے۔

اس آیت سے پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربٰو لینے سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائیگا اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربٰو لینے سے باز آجاؤ اور توبہ کرو، تو تم اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس کے بعد ہے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹)۔ اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہو گا۔ اس سے واضح ہے کہ:

۱۔ اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوتا۔

۲۔ اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے، تو یہ مقروض پر ظلم ہو گا۔

اسی کا نام ربٰو ہے۔ یعنی زرِ اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا ــــ ربٰو کی اس قرآنی تعریف کی رُو سے، اس مسئلہ میں نہ کسی قسم کا الجھاؤ رہ جاتا ہے نہ التباس۔ نہ کوئی دشواری پیش آتی ہے نہ مشکل۔

۲ــــ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سود در سود (سود مرکب) تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ بوجوہ غلط ہے اس کی تائید میں حسب ذیل آیت پیش کی جاتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۳/۱۲۹)

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

"اے ایمان والو! یہ دو چند سہ چند ہونے والا ربٰو کھانا چھوڑ دو"

یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضٰعَفَةً دراصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی "کم کرنے" کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہٰذا، آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربٰو جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت (ضَعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربٰو سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قومی معیشت

بہت گھٹ جاتی ہے، بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ ربٰو سے افراد کی کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور قومی دولت میں کمی آجاتی ہے۔

قرآن کی رُو سے ربٰو کے معنی ہوئے، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظامِ معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اُٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ، محنت (LABOUR) کا ہے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ انسان

معاوضہ کس چیز کا جائز ہے؟ صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حق دار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا، لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو، وہ ربٰو ہے۔ جو قرآنِ کریم کی رُو سے حرام ہے اور "خدا اور رسول" کی طرف سے اعلانِ جنگ کا مستوجب۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشت کار آپ سے ایک ہزار

ربٰو کی مختلف شکلیں روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ ایک قطعۂ اراضی خرید کر اس میں کاشت کرے اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اُسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے۔ لیکن اسی روپے سے وہ قطعۂ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پٹہ پر دے دیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے

کیا یہ ربٰو نہیں؟

یا ایک دکاندار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے۔ آپ اسے روپیہ دے دیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کو منافع کا حصہ دیئے جاتا ہے۔ لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے — کیا یہ ربٰو نہیں؟

یا، آپ اس کاروباری آدمی کو براہِ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بینک میں جمع کر دیتے ہیں اور بینک والے اس روپے کو بطور قرض، اس کاروباری آدمی کو دے دیتے ہیں۔ وہ اس قرض پر جو سود ادا کرتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے اور آپ کا اصل زر بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے — کیا یہ ربٰو نہیں؟ یہ سب ربٰو ہے اور قرآن کی رُو سے ناجائز۔ خواہ اسے سودِ مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے یا سودِ مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں

آپ غور کیجئے تو یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً :-

(۱) **عطیہ** :- اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفۃً دیتا ہے۔ لہٰذا، اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورت مند کی مدد کے لئے حبۃً للہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے وہ ضرورت مند اس امداد کو معاشرہ سے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) **اُجرت** :- یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اس میں سرمایہ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) **ربٰو**:- اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زاید وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصّہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) **منافع** :- (تجارت) اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(شق اوّل کو چھوڑ کر) آپ باقی شکلوں کو دیکھئے۔ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے قرآن جائز قرار نہیں دیتا۔

معاوضہ محنت کا ہے

اس کا اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربٰو میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے۔ اسے دس روپے اصل زر سے زاید وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپیہ قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔ اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) وہ بیع اور ربٰو کو ایک جیسا سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ قیمتِ فروخت میں سرمایہ بھی شامل ہوتا ہے اور دکان دار کی محنت کا معاوضہ بھی۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔

بیع اور ربٰو میں فرق

لیکن ربٰو میں صرف سرمایہ لگتا ہے، محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے جو حرام ہے۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اصول یہ ہے کہ :-

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربٰوٰ ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا، محنت کا نہیں۔ اس بات کا تعین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ ہونا کیا چاہیئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (RISK) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور ربٰوٰ میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلت اور حرمت کے لئے یہ معیارِ تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہی ہو تو جُوا عین حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربٰوٰ میں فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے ــــ بیع میں (رأس المال + محنت کا معاوضہ) واپس ملتا ہے اور ربٰوٰ میں (رأس المال + رأس المال کا معاوضہ) ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ رأس المال کا معاوضہ حرام۔

دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رُو سے ربٰوٰ کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواریاں آجکل پیش آرہی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ:۔

(۱) ربٰوٰ کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنھیں قرآنِ کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بدقسمتی سے) ہماری "مروّجہ شریعت" اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربت۔ یعنی کاروبار میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جا سکے وغیرہ)۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ محنت کے تصوّر سے انہیں پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے وہ ربٰوٰ کے قرآنی تصوّر کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہو گیا ہے۔

پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا

لیکن وہ پیوند، اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتی۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے:۔

(۱) زمین ذریعۂ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا، پانی، روشنی کی طرح) نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اُمّت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے ــــ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے

لئے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی، اس لئے افراد کے لئے جائدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دستِ نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہٰذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دکاندار اشیائے ضروریات تقسیم کرتے کی بجنسی ہوگا۔ اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اسے اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف سے ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں ربٰو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ

دو متضاد نظام

ربٰو سود کا نام نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرکے کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے ——— غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو "خدا اور رسول کے خلاف بغاوت" قرار دیا ہے۔ یہ نظام فی الواقعہ قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ سوچیئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربٰو کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کریں۔ اس قسم کی کوشش ہم نے اس سے پہلے اپنے جاگیرداری اور زمینداری دور (عہدِ عباسیہ میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی، مضاربت، تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ اگر ہم نے اب اپنے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو علیٰ حالہٖ رکھتے ہوئے اس میں سود (ربٰو) ختم کرنے کی کوشش کی تو اس میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ قرآن کے معاشی نظام میں ربٰو خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور غیر قرآنی (سرمایہ دارانہ) نظام میں یہ ختم نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی شکلیں بدل سکتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہو چکا ہے۔

قرآنی نظامِ ربوبیت ——— آئندہ شمارہ میں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محمد عمر دراز

وحی صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے

محترم خواجہ ازہر عباس صاحب کا مضمون بعنوانِ بالا، طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا، بغور پڑھا۔ میں اس سلسلہ میں کچھ مزید نکات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لسانِ مبارک سے قرآنِ کریم میں یہ کہلوایا گیا ہے:

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ ۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ ۰ (۶/۱۹)

"(اے رسول!) ان سے کہہ دیجئے کہ سب سے بڑی شہادت کس چیز کی ہو سکتی ہے۔ کہیئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور مجھ پر یہ قرآن وحی کیا جاتا ہے تاکہ میں تمہیں اور جن تک یہ قرآن پہنچے، انہیں، غلط روشِ زندگی کے نتائج سے آگاہ کروں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اس آیۂ جلیلہ کے سامنے آجانے کے بعد، اللہ، اس کے رسولؐ اور اس رسولؐ کے ہاتھوں بھیجی جانے والی کتاب، قرآنِ حکیم پر ایمان رکھنے والے کسی بھی شخص کو کوئی ابہام نہیں رہنا چاہیئے کہ حضورؐ پر جو وحی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجی گئی، وہ کس کتاب میں ملے گی۔ خدا کے رسولؐ نے اللہ کی گواہی میں یہ بات فرمادی کہ مجھ پر یہ قرآن وحی کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی کسی کو، کہیں اور کچھ کی بھی تلاش ہو تو اللہ کا یہ ارشاد بھی سامنے لے آئے کہ

اَلرَّحْمٰنُ ۰ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۰ (۵۵/۱-۲)

"الرحمٰن (اللہ) نے قرآن کی تعلیم دی۔"

حقیقت یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ، جو انسان کے خالق ہیں، جانتے تھے کہ بعد کے مسلمان، قرآن کے لئے مثلہٗ معہٗ لانے کی کوشش کریں گے، اس لئے اس نے واضح ترین الفاظ میں ارشاد فرمادیا کہ ایسا ممکن نہیں:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝

"اے رسول! کہہ دیجئے کہ اگر (روئے زمین کے) تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ قرآن کی مثل (یعنی قرآن جیسا) بنا لائیں، تو یہ ایسا نہیں کر سکیں گے چاہے یہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کیوں نہ کر لیں۔"

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو (غور فرمایئے کسی کم درجہ کے انسان کو نہیں بلکہ اپنے رسولؐ کو) یہ انذار (وارننگ) بھی دے دی کہ:۔

وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝

"اور اگر یہ (پیغمبر) ہمارے ذمہ کچھ ایسی باتیں لگا دے جو ہم نے نہیں کہیں، تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے، پھر ان کی رگِ دل کاٹ ڈالتے۔"

جو اللہ اپنے رسولؐ کو (کہ جو انسانیت کی دنیا میں سب سے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہیں) ایسے سخت عواقب کی انذار دے رہا ہے، وہ یقیناً رسولؐ سے کم درجے کے انسانوں کی ایسی حرکت پر انہیں بھی یہی سزا دے گا۔ کیا ان لوگوں کو جو "خارج از قرآن" وحی تلاش کرتے اور اس جویائی کا منبع حضور نبی اکرمؐ کی طرف ٹھہراتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اس جیسا بھی دیا گیا ہے، ذرا بھی خوف نہیں آتا کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝ (۸۵/۱۲)

قرآن کریم میں آتا ہے کہ روزِ محشر حضور نبی اکرمؐ، خدا کے حضور یہ شکایت کریں گے کہ:

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (۲۵/۳۰)

"اور رسولؐ (اُس دن) کہیں گے کہ اے میرے پروردگار یہی ہے میری قوم جس نے قرآن کو مہجور بنا دیا تھا۔"

آپ نے دیکھا ہو گا کہ جو گائے یا بھینس دوڑ جاتی ہو، اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسّی باندھ دیتے ہیں اور اس رسّی کا دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیتے ہیں لیکن رسّی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے۔ وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ہے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ عرب گھوڑوں اور

اونٹوں کو اسی طرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے۔ اس طرح بندھے ہوئے جانور کو مَهْجُورٌ کہا جاتا تھا۔ اَلْهِجَارُ اس رسی کو کہتے تھے جس سے انہیں اس طرح جکڑا جاتا تھا۔ رسول اللہ، خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآنِ کریم کو اپنے خود ساختہ اعتقادات، خیالات، رسومات، روایات، قوانین، تفاسیر وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر مَهْجُورٌ بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اٹھا سکتا تھا، انہوں نے قرآنِ کریم کو چھوڑا نہیں تھا، سینوں سے لگا رکھا تھا لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں۔

غور فرمائیے رسولِ اکرمؐ، اللہ سے شکایت یہ کریں گے کہ میری قوم نے قرآن کو مہجور بنا چھوڑا تھا۔ حضورؐ یہ نہیں کہیں گے کہ میری قوم نے کسی مثلہٗ معہٗ کو مہجور بنا رکھا تھا۔ حضورؐ کو ایسا کہنے کی ضرورت اس لئے پیش نہیں آئے گی کہ حضورؐ پر صرف قرآن وحی کیا جاتا تھا اور آپؐ صرف قرآن ہی کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کے مکلف تھے اور آپؐ نے صرف قرآن ہی انسانوں تک پہنچایا۔ اسی لئے حضورؐ کے علم میں یہ بات آئی کہ لوگ آپؐ کے اقوال (احادیث) بھی لکھ رہے ہیں تو آپؐ نے سختی سے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور حکم دیا کہ:

لا تکتبوا عنّی شیءٍ غیر القراٰن و من کتبہٗ فلیمحہٗ

مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ مت لکھو۔ اگر کسی نے ایسا کچھ لکھا ہے تو وہ اُسے مٹا ڈالے۔

حضورؐ کی یہ حدیث اس بات کا اتنا بیّن ثبوت ہے کہ آپ پر صرف قرآن وحی ہوتا تھا۔

مزید برآں قرآنِ کریم کے مندرجہ ذیل مقامات پر بھی نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ کیا ان ارشاداتِ ربانی کی روشنی میں "وحی خارج از قرآن" کا کوئی امکان بھی باقی رہ جاتا ہے؟

- وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ

(۲۷/۹۱-۹۲)

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبردار رہوں اور یہ بھی کہ میں قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں۔"

- اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ

"جس اللہ نے آپ پر قرآن (کے احکام پر عمل اور اس کی تبلیغ) کو فرض کیا ہے، وہ آپ کو اپنے اصلی وطن میں پھر پہنچائے گا۔"

- وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۙ (۳۶/۶۹)

"ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی نہ ہی شاعری اس کے شایانِ شان ہے۔ یہ تو تاریخی حقائق اور قرآنِ مبین (ایک واضح ضابطہ حیات) ہیں۔"

- فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝

آپ قرآن کے ذریعے ایسے شخص کو نصیحت کرتے رہیئے جو ہماری وعید سے ڈرتا ہو۔

- اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝

ہم نے آپ پر قرآن تدریجاً نازل کیا ہے۔

- بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝

"(قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلانے کے قابل ہو) بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔"

- اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ.... ۝ (۱۷/۹)

"بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی اور توازن بدوش ہے۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت کے طور پر بھی قرآن ہی کو اللہ نے پیش کیا ہے۔

- وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

"ہم قرآن کو اس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ آپ (ہمارے) رسولوں میں ہیں۔"

غور فرمایا آپ نے کہ اللہ تعالیٰ نے کن کن گوشوں اور زاویوں سے یہ بات واضح کی ہے کہ حضورؐ کی وحی صرف قرآنِ کریم ہے۔ یہ بات کچھ ایسی مشکل تو نہیں کہ سمجھ میں نہ آئے۔ بات دراصل کچھ اور ہے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیئے

ذہن میں لایئے اس مقام کو جب خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ فاروق کے دورِ خلافت میں ایران فتح ہوا۔ ایران کا گورنر ہرمزان پابجولاں حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا، تو آپ نے اس سے سوال کیا کہ "ہرمزان آج سے پہلے جتنی جنگیں بھی ہوئیں، تم، ہم عربوں کو بڑی آسانی سے شکست دے دیا کرتے تھے۔ اب کیا ہو گیا ہے کہ انہی عربوں کے ہاتھوں تمہاری سلطنت تاخت و تاراج ہو رہی ہے، تم میرے سامنے یوں پابجولاں کھڑے ہو اور تمہارا شہنشاہ جان بچانے کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے۔ ہرمزان نے جواب میں کہا تھا کہ "عمرؓ، یہ بات بڑی آسان فہم ہے۔ پہلے کی جنگوں میں ایک طرف تم عرب ہوتے تھے اور دوسری طرف ہم ایرانی۔ ہم ایرانیوں کے لئے تمہیں شکست دینا، ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن اب جو جنگیں ہو رہی ہیں، ان میں ہم ایرانی تو حسبِ سابق اکیلے ہیں، جب کہ تم عربوں کے ساتھ تمہارا

خدا بھی ہوتا ہے اور ان دو کو ہم تو کیا، دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔"

یہ تھا، اس دَور کے مسلمانوں کی عظمت اور کامیابیوں کا سبب اور ان کی قوت کا راز یعنی ان کے ساتھ خدا کا ہونا ظاہر ہے خدا چل کر کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ جو کچھ ہرمزان نے کہا تھا وہ ان قرآنی آیات کی ترجمانی تھی جن میں کہا گیا ہے کہ:۔

اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۸/۱۹)

"بلاشبہ اللہ مومنین کے ساتھ ہے۔

اور وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۳۰/۴۷)

مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔

مسلمان خدا کی کتاب (قرآنِ حکیم) کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے، اس کا نتیجہ، ان کے دین کے تمکّن اور خدا کے اس وعدے کا عملی ثبوت تھا کہ:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ (۴/۱۴۱)

"خدا (جب تک خدا ہے) کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ کافر مومنین پر غلبہ حاصل کر لیں۔"

اور اس وعدے کا بھی عملی ثبوت کہ

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۹)

"اگر تم ان صداقتوں پر ایمان لے آؤ (جو ہم نے اس رسول کے ذریعہ اپنی کتاب میں نازل کی ہیں)، تو تم ہی دنیا میں سربلند ہو گے۔"

ایرانی تو اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ جب تک خدا مسلمانوں کے ساتھ ہے، ہم (یا دنیا کی کوئی طاقت) ان پر غالب نہیں آ سکتی۔ لہٰذا ان سے اپنی شکستوں کا انتقام لینے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے ان کے خدا کا ساتھ چھڑایا جائے یعنی ان کا کتاب اللہ (قرآنِ حکیم) سے تمسک ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد ہماری ساری تاریخ اس اجمال کی تفصیل ہے کہ ہم سے ہمارے خدا کا ساتھ (یعنی اس کی کتاب قرآنِ کریم سے ہمارا تمسک) کس طرح چھڑایا گیا۔ اس کے لئے جو سازشیں کی گئیں، ان میں سے کچھ اس طرح تھیں کہ مسلمانوں میں یہ عقائد داخل کئے گئے کہ:

۱۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ مجھے قرآن اور مثلہٗ معہٗ دیا گیا ہے۔

۲۔ قرآن کی کئی مختلف قرأتیں تھیں۔

۳۔ قرآن کی کئی آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔

۴۔ قرآن احادیث کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

ـ قرآن تفاسیر کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا وغیرہ وغیرہ۔

قرآن نے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ..... ۝ (۱۷/۹)

ـ یہ کہ قرآن، انسانیت کے لئے (راہوں کو منور کرنے والا) نور (روشنی) اور ہدایت ــــ ہے (۶/۹۱) ــــ

مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ہے (۱۰/۵۷) یعنی ایسی ہدایت ہے جس میں سینوں کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ قرآن میں ہر وہ چیز بیان کردی گئی ہے جس کا بیان کیا جانا انسانیت کے لئے ضروری تھا (۱۶/۸۹، ۱۷/۵۸، ۳۰/۵۸، ۳۹/۲۷)۔ قرآن کو سمجھنے والوں (کی نصیحت) کے لئے آسان بنایا گیا ہے (۵۴/۱۷)۔

ـ عربی زبان کی صاف صاف کتاب ہے اور اس میں کوئی پیچ و خم نہیں تاکہ یہ لوگ (اسے سمجھ کر) زندگی کے خطرات سے بچ سکیں۔ (۳۹/۲۸)

ہماری سمجھ میں تو یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ کے متذکرہ بالا ارشادات کی روشنی میں، کون سی بات باقی ہے جس کی بنا پر کچھ لوگ، اللہ کی وحی کو "خارج از قرآن" مقامات میں ڈھونڈتے ہیں۔

جاتے جاتے اس ضمن میں مقطع کا بند بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ (۲۹/۵۱)

"(ان سے اے رسول کہہ دیجئے) کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ کی طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے" (اور)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۹/۵۱)

"جو لوگ اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں گے، ان کے لئے اس میں سامان رحمت و ربوبیت ہوگا اور شاہراہِ حیات کے ہر موڑ پر اس امر کی یاد دہانی کہ انہیں کس طرف جانا چاہیئے"۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ اس کتاب کی وارث قوم 'مسلمان'، کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ العلم، الحق اور نور صرف خدا کی کتاب عظیم، قرآن حکیم ہے اور یہی کتاب حضور نبی اکرمؐ پر وحی کی گئی تھی اور یہ قوم وحی کو "خارج از قرآن" ڈھونڈھنا چھوڑ دے۔ کیونکہ قرآن کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ظنی ہے، قیاسی ہے اور ہرگز ہرگز ایمان و ایقان کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے سید احمد خاں علیہ الرحمہ نے "رجعت الی القرآن" کا آوازہ بلند کیا، اسی کو حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے آگے بڑھایا جبکہ علامہ اقبالؒ نے بھی یہی کہا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن جز بقرآن زیستن

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے انہی السابقون الاوّلون کی رہنمائی میں مملکتِ پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا، تو اس مملکت کے نظام کے متعلق واضح ترین الفاظ میں کہا کہ:

"اس مملکت میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہوگی"

قائداعظمؒ کی قیادت میں علامہ غلام احمد پرویزؒ نے اسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے شب و روز صرف کئے۔ پاکستان، نیشنلسٹ علماء کی تمام تر مخالفتوں کے علی الرغم وجود پذیر ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں، مجلہ طلوعِ اسلام کا اجراء اس غرض سے کیا گیا کہ قوم کو بتایا جائے کہ اس قرآنی نظام کے خط و خال کیا ہیں، جس کے قیام کے لئے اسلامیانِ ہند نے اپنی تمام تر بے بضاعتیوں اور بے سروسامانیوں کے باوجود، اپنے عظیم قائد کے لواء تلے، تن من دھن کی بازی لگا دی تھی اور اللہ نے ان کی مساعی کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے انہیں مملکتِ پاکستان کی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز فرمایا۔ اس وقت سے لے کر اپنی وفات (۱۹۸۵ء) تک علامہ غلام احمد پرویزؒ قوم کو یہی پیغامِ حیات آور دیتے رہے کہ:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

آج روئے زمین پر، مسلمان ممالک اور مسلمان نام رکھنے والی قوم، انسانی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ ہیں لیکن مسلمان ایسے ممالک میں ہوں جہاں ان کی اپنی حکومت ہے یا ایسے ممالک میں جہاں وہ غیروں کی حکومت تلے زندگی بسر کر رہے ہیں، غرضیکہ جہاں جہاں بھی ہیں اقوامِ مغرب کے دستِ نگر ہیں اور ان کی کس مپرسی اور حالتِ زار، رہ رہ کر علامہ اقبالؒ کے اس تجزیہ کی یاد دہانی کراتی ہے کہ "ہمارے اسلاف نے قرآن ہی کے اتباع سے اقوامِ عالم میں سرفرازی اور سربلندی حاصل کی تھی اور قرآن ہی سے روگردانی نے ہمیں آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ ہم قدم قدم پر اپنے مقاصد کی برومندی کے لئے اقوامِ مغرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

ہماری نشاۃِ ثانیہ کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ قرآنِ کریم کا بتایا ہوا صراطِ مستقیم ہے۔ جب تک ہم قرآنِ کریم کو اپنی خود ساختہ زنجیروں سے آزاد کر کے، اسے اپنی زندگی کے ہر معاملے میں آخری سند اور حجت تسلیم نہیں کرتے ہمیں حیاتِ نو نہیں مل سکتی اور ہم قعرِ مذلت میں گرتے ہی چلے جائیں گے۔ ہم نے قرآن کے علاوہ ہر آستانہ آزما کر دیکھ لیا ہے۔ ملوکیت، ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریت سبھی نے ہماری مشکلات میں اضافہ ہی کیا ہے۔ ہمیں آخر کار قرآن ہی کے درِ عالی پر سر جھکانا پڑے گا۔ ہمیں قوم کو، تمام تر مثلہ، معہ، فقہوں اور فرقہ بندیوں سے آزاد کر کے، قرآنِ خالص کی طرف لانا ہوگا، قرآن کو سمجھنا ہوگا اور اس کی تعلیم ہی کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے، تو اللہ کا یہ انذار پورا ہو کر رہے گا:

وَ ان تتولوا یستبدل قوما غیرکم لا یکونوا (۴۷/۳۸)

اگر تم روگردانی کرو گے، تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

بلاشبہ، جو علمی سرمایہ ہم تک ہمارے اسلاف سے منتقل ہو کر آیا ہے، ہم قرآن کریم کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، جہاں جہاں ہمیں قرآنی احکام و اصول اور اقدار کے مطابق رہنمائی ملتی ہے، ہم اُس سے استفادہ کر سکتے ہیں لیکن اسے قرآن پر عمل کے راستہ پر ہمارے لئے سدِ راہ نہیں بننا چاہیئے۔ قرآن فہمی اور قرآن پر عمل کسی خاص زمانے سے مقید نہیں ہے۔ ہر زمانے کے انسان کو قرآنِ کریم، اس کے حالات کے مطابق رہنمائی دینے کا اہل ہے۔ اور قرآن فہمی کے راستے کسی کے لئے بھی مسدود نہیں کئے جا سکتے۔ قرآن کو سمجھنا، تاکہ اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے، ہر مومن کا فرض ہے۔ قرآن پر تدبر و تفکر کا حکمِ خداوندی، ہر زمانہ کے انسان کے لئے ہے ورنہ قرآن کو قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں محفوظ کرنے کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا۔ کرنے کا کام یہی ہے کہ قرآنِ خالص کی تعلیم کو عام کیا جائے اور قرآن سے باہر ہر دوسری چیز کو قرآنِ کریم ہی کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ قرآن کے متعلق تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

جب قلبِ انسانی قرآن کو اپنے اندر بسا لے، تو یہ زمین و آسمان بدل جاتے ہیں۔ یاد رکھئے، حضرت عمرؓ نے قرآن کی اسی خصوصیت کے متعلق فرمایا تھا کہ

اِن اللہ یَرفع بالقرآن اقوامًا و یضع بالقرآن اقوامًا

خدا قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے قرآن کے مطابق کرتا ہے

جس ایرانی سازش سے رسولِ اکرمؐ کا لایا ہوا عربی اسلام، آج کا ایرانی اسلام، بنایا گیا، اس کا توڑ ممکن ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کو اس ملبہ کے نیچے سے نکالا جا سکتا ہے اور یقیناً ایسا کیا جا سکتا ہے،

بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے، وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے، وہ جسے رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ

"ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔" (خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی پرویزؒ صاحب کی عمر بھر پکار رہی ہے اور اسی پکار کو عام کرنے میں شاگردانِ جناب پرویزؒ مصروفِ تگ و تاز ہیں، بایں دعا کہ

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ثریا عندلیب

ازلی و ابدی روشنی

۱۔ قرآن لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ (۱۴/۱ ; ۶۵/۱۱)
۲۔ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ تم غور و تدبر کرو۔ (۳۸/۲۹)
۳۔ قرآن کے احکام اور قوانینِ فطرت دونوں آیات اللہ ہیں۔ (۶—۲/۴۵)
۴۔ اللہ اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم لوگ غور و فکر کر سکو۔ (۲/۲۱۹ ; ۷/۱۷۶ ; ۳۹/۴۲ ; ۵۹/۲۱)
۵۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے احکامِ خداوندی کو مذاق سمجھتے ہیں۔ (۵/۵۸)
۶۔ اہلِ جہنم کہیں گے کہ اگر — عقل و فکر سے کام لیتے، تو آج جہنم میں کیوں ہوتے۔ (۶۷/۱۰)
۷۔ صاحبِ علم کو چاہیئے کہ اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ (۲/۲۸۲)
۸۔ تخلیقِ ارض و سمٰوٰت اور گردشِ لیل و نہار میں اربابِ عقل و فکر کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہ لوگ اُٹھتے بیٹھتے لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیقِ ارض و سما میں غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کی کوئی شے بے مقصد پیدا نہیں کی گئی۔ (۱۹۰—۳/۱۸۹) ; (۲۱/۱۶)
۹۔ ہم نے غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے اپنی آیات نکھار کر بیان کر دی ہیں۔ (۱۰/۲۴)
۱۰۔ قرآن ہی وحی کیا گیا ہے اور کچھ نہیں۔ (۶/۱۹ ; ۱۸/۲۷)
۱۱۔ جو قرآن میں نہیں، اسے شریعت بنا دینے والے خدا کے شریک (مشرک) ہیں۔ (۴۲/۲۱)
۱۲۔ ہر اختلافی معاملہ میں حَکَم قرآن ہے۔ (۳/۲۲ ; ۶/۱۱۵ ; ۱۶/۶۴ ; ۴۲/۱۰)
۱۳۔ تمام انسانوں کے لئے قرآن میں تعلیم ہے۔ (۳۰/۵۸ ; ۳۹/۴۱)
۱۴۔ قرآن سمجھنے کے تین طریقے ہیں۔ علمِ حاضر، عملی نتائج، تاریخی شواہد۔ (۱۰/۳۹ ; ۲۷/۸۴)
۱۵۔ قرآن سے اعراض برتنے والے سے زیادہ ظالم کون ہوگا۔ (۱۸/۵۷)

۱۶۔ یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ (۴۷/۲۴)
۱۷۔ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آسکتی جب تک اس کی نفسیات (قلب و نگاہ) میں تبدیلی نہیں آجاتی۔ (۸/۵۳)
۱۸۔ اجتماعی طور پر خدا کے متعین کردہ راستے کی طرف لوٹ آنے سے کامیابی ملتی ہے۔ (۲۴/۳۱)
۱۹۔ ضرورت مندوں کا حق ادا کر دینے والے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ (۳۰/۳۸)
۲۰۔ جو دوسروں کی ضروریات کو اپنے پر ترجیح دے اور دوسروں کو پیچھے ہٹا کر سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لینے کے جذبے سے بچ جائے، وہ کامیاب ہوگا۔ (۵۹/۹ ؛ ۶۴/۱۶)
۲۱۔ جو خود ثابت قدم رہے، دوسروں کی ثابت قدم رہنے میں مدد کرے، رابطِ باہمی قائم رکھے، اس سے کامیابی نصیب ہوگی۔ (۳/۱۹۹)
۲۲۔ خبیث کی کثرت کتنی ہی تعجب انگیز ہو، وہ طیّب کے برابر نہیں ہو سکتی۔ (۵/۱۰۰)
۲۳۔ کیا تُو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جو تکذیبِ دین کرتا ہے؟ یہ وہ ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے۔ مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کرتا، نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ وہ مصلّین ہیں جو اپنی صلوٰۃ کے مقصود سے غافل ہیں۔ یہ رزق کے سرچشموں پر بند لگا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ (۱۰۷/۱-۷)
۲۴۔ قرآنی تعلیم کو چھپانے والوں پر خدا کی بھی لعنت اور ہر لعنت کرنے والے کی لعنت بھی۔ (۲/۱۵۹)
۲۵۔ جو تمہارے دین (اسلام) کو مذاق سمجھیں، انہیں دوست مت بناؤ۔ (۵/۵۷)
۲۶۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس تمہیں زندگی کے حقیقی مقصد کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔ (۱۰۲/۱)
۲۷۔ اگر انسان وحی کے تابع نہ چلے، تو مال کی کثرت اسے حق کی مخالفت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ (۶۸/۱۴ ؛ ۷۱/۲۱)
۲۸۔ مال کو جمع کرنا اور اسے انسانیت کی بہبود کے لئے کھلا نہ رکھنا، عذابِ جہنّم کا موجب ہے۔ (۹/۳۵)
۲۹۔ دولت کے بل بوتے پر لیڈر بن جانے والے تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ (۷۱/۲۱)
۳۰۔ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے جدّوجہد میں مال کا نقصان بھی ہوتا ہے، لیکن یہی اس مال کا صحیح مصرف ہے۔ (۲/۱۵۵)
۳۱۔ مال اس بات کی جانچ بنتا ہے کہ تم حق و صداقت کی راہ میں کس قدر ایثار کر سکتے ہو۔ (اس کو ابتلا کہتے ہیں) (۲/۱۵۵ ؛ ۳/۱۸۵)
۳۲۔ مومن کے مال میں محتاج اور ضرورت مند کا حق ہوتا ہے، وہ اسے بطور حق لے سکتے ہیں۔ اس لئے خیرات یا بھیک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (۵۱/۱۹ ؛ ۷۰/۲۴)
۳۳۔ مال کی گردش اوپر کے طبقے ہی میں محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ اسے خون کی گردش کی طرح پورے معاشرہ کے اندر یکساں طور

پر گردش کرنا چاہیئے۔ (۵۹/۷)

۳۴۔ کُفر یعنی قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت سے انکار کی وجہ سے نظامِ سرمایہ داری قائم ہوتا ہے اور یہی لوگ سب سے پہلے نظامِ خداوندی (دین) کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۳۴/۳۴)

۳۵۔ تم بِرّ اور کشادگی تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان چیزوں کو خدا کی راہ میں نہ دیدو جو تمہیں محبوب ہوں۔ (۳/۹۲)

۳۶۔ انسان چاہتا ہے کہ سارا مال سمٹ کر اس کے پاس آجائے۔ (۸۹/۲۰)

۳۷۔ حسنِ عمل کا معیار یہ ہے کہ وہ عمل عالمگیر انسانیت کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ (۱۳/۱۷)

۳۸۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین ہر فرد کے جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی رُو سے ہوگا۔ (۴۶/۱۹)

۳۹۔ جب تسخیرِ فطرت اور عملِ تخلیق مستقل اقدار ہیں تو ظاہر ہے کہ نعمائے کائنات (پرورش، آسائش و آرائش کی چیزوں سے) متمتع ہونا بھی ایک مستقل اصولِ حیات ہے اس کی قرآن نے بڑی تاکید کی ہے۔ (۷-۱/۶؛ ۸۹/۸؛ ۲۷/۱۴؛ ۱۷/۲۰؛ ۱۷/۷۲؛ ۲۰/۱۲۴؛ ۲۲/۴۱؛ ۲۴/۵۵؛ ۶-۵/۲۸؛ ۳۳/۲۷)

۴۰۔ ماپ تول کے پیمانے درست رکھو، اس میں پورا نظامِ معیشت آجاتا ہے۔ (۶/۱۵۳؛ ۷/۸۵؛ ۲-۱/۸۳)

۴۱۔ زمین تمام افراد کو رزق بہم پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتی۔ (۱۵/۲۰؛ ۲۰/۵۴؛ ۳۳/۹)

۴۲۔ اللہ کی زمین اللہ کی مخلوق کے لئے۔ (۷/۷۳؛ ۱۱/۶۴، ۲۶/۱۵۵؛ ۴۱/۱۰؛ ۵۵/۱۰؛ ۹۱/۱۳)

۴۳۔ جب رزق کے ذرائع قوانینِ خداوندی کے تابع آجائیں، تو پھر "آسمانوں کا خدا" "عملاً" "زمین کا خدا" بھی بن جاتا ہے۔ (۴-۳/۶؛ ۱۶/۵۲؛ ۲۱/۲۱؛ ۲۹/۶۰؛ ۴۳/۸۴)

۴۴۔ لوگ اپنے اعمال بھول جاتے ہیں، خدا انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ (۵۸/۶)

۴۵۔ اللہ لوگوں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ (۸۵/۲۰)

۴۶۔ غلط اعمال راکھ کی طرح ہوتے ہیں جو یونہی اڑ جاتے ہیں۔ (۱۴/۱۸؛ ۲۴/۳۹)

۴۷۔ اس سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے جو بغیر ہدایتِ خداوندی اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ (۲۸/۵۰)

۴۸۔ اگر الحق لوگوں کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جائے، تو کائنات میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ (۲۳/۷۱)

۴۹۔ مستقل اقدار سے انکار کرنے والوں کو دنیاوی مفاد بہت دیدہ زیب نظر آتے ہیں۔ (۲/۲۱۲)

۵۰۔ اسلام ہی صراطِ مستقیم ہے اور یہی خدا کا سیدھا راستہ ہے۔ (۶/۱۲۶)

قاسم نوری

فکرِ قرآنی کا سفر ۹۱ء کے آئینے میں

طلوعِ اسلام۔ ماہ بہ ماہ

یہ کہاوت ہی نہیں، ایک اٹل حقیقت بھی ہے کہ "غلط راستہ صحیح منزل پر کبھی نہیں پہنچایا کرتا"۔ اس لئے زندہ قوموں کا شعار یہ ہوتا ہے کہ وہ جس مقصد کی راہ میں سرگرمِ سفر ہوتی ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر رُک کر یہ جائزہ بھی لیتی رہتی ہیں کہ ان کے قدموں کے رُخ غلط سمتوں کی طرف تو نہیں ہیں یا ان کے عزائم اور ولولوں میں تھکن اور بے کیفی تو پیدا نہیں ہونے لگی ہے یا انہوں نے اپنے مقصد اور نصب العین کو فراموش تو نہیں کر دیا ہے؟! یہ جائزہ اور خود احتسابی کا یہ عمل نہ صرف انہیں ہر لحظہ تر و تازہ اور ولولہ انگیز رکھتا ہے بلکہ ان کی ہمتوں کے رگ و پے میں جو لانیاں بھرتا چلا جاتا ہے۔ آسودگیٔ منزل کا فرحت بخش تصور انہیں راستے کی صعوبتوں کا احساس تک نہیں ہونے دیتا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیثِ مبارک کا مفہوم ہے کہ "وہ تباہ ہوا جس کے دو دن ایک جیسے گزر گئے"۔ جس فرد یا قوم کے سامنے واضح اور متعین مقصد ہو، اس کے دو دن تو کجا دو منٹ بھی ایک جیسے نہیں گزر سکتے۔ یکسانیت، درحقیقت سکون اور ٹھہراؤ کی علامت ہوا کرتی ہے اور قرآنی اصطلاح میں سکون اور ٹھہراؤ تو موت کا نام ہوتا ہے۔ زندگی وہیں ہے جہاں حرکت ہے اور حرکت وہیں ممکن ہے جہاں کوئی نصب العین ہو اور متعین مقصد ہو۔ موڈ، ڈپریشن، تھکن، نروس بریک ڈاؤن، پچھتاوا ـــــ نفسیاتی پیچیدگیاں اور بیماریاں وہیں اور اسی قوم میں جنم لیتی ہیں جو "مقاصد و عزائم" سے بے بہرہ ہو جائیں۔

علامہ اقبالؒ کے کہنے پر جب قائداعظم علیہ رحمۃ نے محترم علامہ غلام احمد پرویزؒ سے "طلوعِ اسلام" کے اجراء کی تاکید فرمائی، تو جہاں اس رسالہ کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید اور نیشنلسٹ علماء کے بے سروپا، گمراہ کن پروپیگنڈے سے سیدھے سادے مسلمانوں کو بچانا تھا، وہاں اہم مقصد یہ بھی تھا کہ مختلف روایتوں، رسموں، تہذیبوں اور ملکوں کے اثرات سے قرآنی تعلیمات کو پاک صاف کیا جائے اور پاکستان میں خالصتاً قرآنی اقدار و قوانین کی حکومت قائم کرنے کی سبیل پیدا کی جائے۔

۱۹۴۷ء سے فروری ۱۹۸۵ء تک یعنی تقریباً نصف صدی تک تن تنہا علامہ غلام احمد پرویزؒ اس محاذ پر ڈٹے رہے۔

زمانے کے گرم و سرد، نہ انہیں متعین مقصد سے ہٹا سکے نہ زیر کر سکے۔ ؏

ہزار پہرے بٹھائے گئے اُجالوں پر
سحر نکال ہی لایا وہ ظلمتِ شب سے (قاسم نوری)

کوئی لکھنے بیٹھے، تو اس کی راہِ پُرصعوبت کی ایک طویل داستان بلکہ ایک مکمل تاریخ ہے جو اپنے اندر عبرتوں کے لازوال نقوش رکھتی ہے۔ ؏

عجیب شخص تھا، روتا تھا اور نہ ڈرتا تھا
ہزار گردشِ دوراں، گزر گئیں سر سے (قاسم نوری)

یہ اس کا عزمِ محکم اور قرآنِ کریم پر یقینِ کامل تھا کہ جب وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہوا، تو اس کا لگایا ہوا فکرِ قرآنی کا بیج تن آور درخت بن چکا تھا اور اس کی ثمر باریوں سے ایک عالم مستفید ہو رہا تھا۔ قرآن کی روشنی دنیا کے بیشتر ممالک تک پھیل چکی تھی اور لوگ جوق در جوق اس کی طرف کھچے چلے آ رہے تھے ـــــ اور یہ سب اس لئے تھا کہ وہ مردِ دانا و بینا جہاں نگر ہی نہ تھا خود نگر بھی تھا اور اپنی تسبیحِ روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرتا رہتا تھا۔

علامہ پرویزؒ کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری اور تحریک کی نشوونما کی سعادت جنہیں نصیب ہوئی ان کے لئے لازم تھا کہ وہ اس راہ کے ہر موڑ پر رُک کر یہ اندازہ کریں کہ ان کے قدم صحیح سمت میں اٹھ رہے ہیں یا نہیں اور جس مقصد کی تکمیل کے لئے علامہ پرویز علیہ رحمتہ نے اپنی زندگی کا ہر سانس وقف کر دیا تھا، وہ مقصد پیشِ نظر ہے یا نہیں۔

ہر چند کہ خود احتسابی (طلوعِ اسلام ماہ بہ ماہ) کی یہ روایت زیادہ پرانی نہیں ہے اور اس کی ابتدا سال ۱۹۸۹ء کے جائزے سے ہوئی ہے لیکن اس کے بڑے مثبت نتائج سامنے آئے ہیں اور احبابِ تحریکِ قرآنی نے اسے دل سے پذیرائی بخشی ہے۔ بیک نظر اور بیک نشست سارے سال کی کارکردگی سامنے آجاتی ہے ـــ جو خامی، کمزوری، کمی اور کوتاہی ہم سے ہوئی ہے اس کے اعادہ سے بچنے کی راہ نکل آتی ہے اور اس طرح حوصلے تیز قدم اور جذبے زیادہ محکم ہو جاتے ہیں ـــ اس سال سے اس روایت میں ایک حسین اضافہ اور کر دیا گیا ہے ـــ ناظمِ ادارہ و مدیر طلوعِ اسلام محمد لطیف چوہدری صاحب نے دسمبر ۹۱ء کے شمارہ میں "جائزہ" کے عنوان سے تمام قارئین اور دنیا بھر میں طلوعِ اسلام کی بزموں سے ایک اپیل شائع کی کہ طلوعِ اسلام ماہ بہ ماہ کی سرگذشت میں اگر کوئی بزم اپنی یا افرادِ متعلقہ کی کاوشوں کو بھی شامل کرنا چاہے، تو اپنی سالانہ رپورٹ ۱۵ دسمبر تک ناظم ادارہ کو ارسال کر دے ـــ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ صرف رسالہ طلوعِ اسلام میں مطبوعہ مواد تک ہی محدود نہ رہا جائے بلکہ اس کے علاوہ بھی اگر تحریک کو آگے بڑھانے یا قرآنی فکر کو عام کرنے کی کوئی کوشش اور کاوش کی گئی ہو تو وہ بھی منظرِ عام پر آجائے اور اہلِ کاروانِ تحریک کے لئے قوت و حوصلہ کا سبب بنے۔

ـــ آیئے ہم انہی الفاظ کے ساتھ اپنی سالِ گذشتہ کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں جن الفاظ

سے ہم نے اس روایت کا آغاز کیا تھا کہ "..... نئے سال کا موڑ مڑتے ہوئے کچھ دیر کے لئے رُک کر گردن گھما کر ہم پیچھے بھی دیکھ لیں کہ گذشتہ سال کے سفر میں ہم سے کہاں کہاں کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ ہماری ہمتوں کے جوار بھاٹا میں کہاں تیزی آئی ہے اور کہاں کہاں تھکن کا احساس ہوا ہے ۔۔۔ ہمارے عزم کے پاؤں کن کن خارزاروں میں اُلجھ کر زخمی ہوئے ہیں اور کون کون سی نئی جہتیں ہم نے دریافت کی ہیں ۔۔۔ قرآنی فکر و تحقیق کے کتنے نئے افق تلاش کئے ہیں اور اس بحرِ فرقانی میں غوّاصی کے لئے، کتنے نئے غوّاص ڈھونڈے ہیں۔"

۱۔ سب سے پہلے سال بھر کے مضامین کی فہرست پیشِ خدمت ہے۔

(۱) فکرِ قرآنی کا سفر (خود احتسابی کی نئی طرح نئی روایت)۔ (۲) قرآنی تعلیم بچوں کے لئے (۳) قرآنی معاشرے میں کیا ہوگا؟ (۴) شریعت بل قرآن کے آئینے میں (۵) قصاص، دیت اور عاقلہ (۶) جہنم میں کیا ہوگا؟ (۷) مملکت کی بقا و فروغ کا ابدی اصول (۸) سیاسی پارٹیاں (۹) اِیَّاکَ نَعْبُدُ (۱۰) قائدِاعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت (۱۱) مرا مرنا خلوصِ نوحہ گری کی آزمائش ہے (۱۲) بانس کی پلیٹ (۱۳) کون سمجھے گا اُسے؟ (۱۴) عقیدت کے پھول (۱۵) خلیجی بحران (۱۶) پیٹ کی آگ (۱۷) وہ ماحول کہاں؟ (۱۸) تباہ کن جرائم (۱۹) اصولِ حیات (۲۰) خلیجی دیپک راگ (۲۱) اسلامی شریعت کے بنیادی اصول (۲۲) نظامِ حکومت قرآنی تصور (۲۳) مکافاتِ عمل (۲۴) آخرت (۲۵) روزے کے احکام (۲۶) اجتماعی زندگی (۲۷) حج کا مقصد (۲۸) کرنے کا کام (۲۹) تجارت (۳۰) روداد طلوعِ اسلام کنونشن (۳۱) قصاص اور دیت (۳۲) اسلام میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں کا وجود (۳۳) تغیرِ نفس (۳۴) میرے تصور کا پاکستان (۳۵) عید (۳۶) انسانیت آرزو (۳۷) یادِ رفتگاں (۳۸) میں بہت دکھی ہوں (۳۹) پیوندی گدڑی (۴۰) آبروئے ما زنامِ مصطفٰے است (۴۱) ختمِ نبوت اور پرویزؒ (۴۲) قرآنِ کریم اور اکیسویں صدی میں عورت کا کردار (۴۳) حرفِ اوّل (۴۴) قانونِ مکافاتِ عمل (۴۵) فریضۂ رسالت (۴۶) ایمانی وحدت اور یہود و نصاریٰ (۴۷) میں وصیت کرنا چاہتا ہوں (۴۸) عیدالاضحٰے (۴۹) شہریوں کی بے چارگی (۵۰) پرویزؒ کی مخالفت (۵۱) منتخب نمائندوں کا احسانِ عظیم (۵۲) باباجی کی یاد میں (۵۳) الاسلام (۵۴) نسخۂ کیمیا (۵۵) شریعت بل (۵۶) نقد و نظر (۵۷) ضیائے فکرِ قرآنی (۵۸) عائلی قوانین (۵۹) آدھی انسان (۶۰) فکرِ پرویز اور ہمارے دانش ور (۶۱) کتاب و سنّت (۶۲) مجلسِ استفسارات (۶۳) اسلام خطرے میں ہے (۶۴) چھ ستمبر، ہماری زندگی اور بقا کی پہلی صبح (۶۵) بھولی ہوئی کہانیاں (۶۶) یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے (۶۷) دو قومی نظریہ (۶۸) سیکولر سٹیٹ (۶۹) وحی صرف قرآن میں ہے (۷۰) جدید ٹیکنالوجی اور علمِ باطن (۷۱) انتباہ (۷۲) جہاں مارکس ناکام رہ گیا (۷۳) وہ ہمارا خواب تھا (۷۴) اراکینِ طلوعِ اسلام کے نام (۷۵) الدّین (۷۶) فسادِ آدمیت کے ابلیسی گوشے (۷۷) تاریخ القرآن (۷۸) ابتدا ہوتی ہے تیرے نام سے (۷۹) نیست ممکن جز بقرآں زیستن (۸۰) میرے نام (۸۱) قائدِاعظمؒ (۸۲) خلافت المسلمین (۸۳) قانون، قانون دان اور قانونی عدالتیں (۸۴) قرآنِ عزیز اور ہم (۸۵) طائفین اور عاکفین (۸۶) اقبال اور فکرِ اسلامی۔

(۸۷) جائزہ (۸۸) حق اور فرض (۸۹) کفر اور کافر۔

● ۔ مستقل عنوانات

لمعات، حقائق و عبر، قرآنی تعلیم بچوں کے لئے۔

● ۔ انگریزی مضامین جو ۱۹۹۱ء میں طلوعِ اسلام کی زینت بنے۔

MEANING OF MARRIAGE, QURAN AND GULF CRISIS, QURANIC SOCIAL ORDER PROVIDE SECURITY FOR THE SURVIVAL OF NATIONS, ISLAMIC SOCIAL ORDER,HOUSE OR HOME ,THE CASTE SYSTEM AS IT EXIST IN PAKISTAN, A TEACHER WAS BORN, TRANSLATION OF QURAN NEED REVISION, THE QURAN AND THE ROLE OF WOMAN IN THE TWENTY-FIRST CENTURY & MUSLIM SHOULD LEARN TO SERVE HUMANITY

● ۔ بچوں کے لئے مضامین جو ۱۹۹۱ء میں طلوعِ اسلام میں شائع ہوئے۔

(۱) عمل (۲) مکافاتِ عمل (۳) آخرت (۴) عید (۵) مرنے کے بعد کی زندگی (۶) عید الاضحیٰ (۷) کفر اور کافر (۸) کائنات (۹) عظیم ترین مثالی بچہ (۱۰) اچھی زندگی (۱۱) حق اور فرض۔

● ۔ عورتوں کے اور عورتوں کے لئے مضامین جو دامنِ طلوعِ اسلام میں محفوظ ہوئے۔

(۱) جہنم میں کیا ہوگا؟ (۲) اِیَّاکَ نَعْبُدُ (۳) بانس کی پلیٹ (۴) قصاص اور دیت (۵) تغیرِ نفس (۶) میرے تصور کا پاکستان (۷) میں بہت دکھی ہوں (۸) قرآنِ حکیم اور اکیسویں صدی میں عورت کا کردار (۹) HOUSE OR HOME (۱۰) باباجی کی یاد میں (۱۱) ضیائے فکرِ قرآنی (۱۲) A TEACHER WAS BORN (۱۳) قرآنِ عزیز اور ہم (۱۴) THE QURAN AND THE ROLE OF THE WOMAN IN THE TWENTY FIRST CENTURY

اہم تحریریں

● ۔ خلیجی بحران عالمِ اسلام

عراق کویت جنگ میں اسلام دشمن غیر مسلم طاقتوں کے رویہ کی وجہ سے تمام عالمِ اسلام بے دردی سے بٹ گیا بلکہ کٹ کر رہ گیا ہے اور تمام امتِ مسلمہ اپنی اپنی مصلحتوں کے خول میں بند، عملی طور پر ٹس سے مس نہیں ہو رہی۔ یہ صورت حال کس قدر افسوسناک ہے اور اس کے نتائج کس قدر بھیانک نکل سکتے ہیں اور اس سے اسلام دشمن ملکوں اور قوتوں کو کس قدر استحکام حاصل ہو سکتا ہے اس کا تجزیہ نہایت دل نشین انداز میں جناب غلام رسول ازہر صاحب نے اس مضمون میں کیا ہے۔ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

o — جہنم میں کیا ہوگا؟

محترمہ سلمیٰ لطیف کا معلوماتی اور اپنی نوعیت کا منفرد انداز کا مضمون ہے جو طلوعِ اسلام میں اپنی اہمیت اور اسی انفرادیت کے باعث دوسری مرتبہ شائع کیا گیا ہے۔ دین کی باتیں اور آخرت کا تصور، جس میں جنّت اور دوزخ کا CONCEPT بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اب تک مذہبی علماء کے وعظوں اور منبر و مسجد کی آوازوں ہی سے سُنا اور سمجھا گیا تھا۔ لیکن سلمیٰ لطیف صاحبہ نے اپنے اس مقالہ میں سائنس کے حوالوں اور سائنسی آلات کی مدد سے دین کی ان باتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ریڈیو اور ٹیلی وژن کے عام فہم اور آسان ٹیکنیکی حوالوں سے لا الٰہ اور قرآن کی بنیادی تعلیم کو واضح کیا ہے۔ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسے مضامین کو نہ صرف بار بار شائع ہونا چاہیئے بلکہ مختلف زبانوں میں اس کے علیٰحدہ علیٰحدہ پمفلٹس کی شکل میں شائع کئے جانے چاہئیں تاکہ ہر مکتبۂ فکر اور شعور کی ہر سطح کے لوگ اور بچّے اس سے استفادہ کر سکیں۔

o — سیاسی پارٹیاں

سیاسی پارٹیوں کے وجود کو خلافِ قرآن قرار دینے کے لئے راولپنڈی (پاکستان) سے جناب عبدالرزاق صاحب نے ایک درخواست وفاقی شرعی عدالت میں پیش کی تھی۔ وفاقی شرعی عدالت میں، اس مضمون میں بعض اہم سوالات اٹھائے گئے۔ طلوعِ اسلام کی ایک یہ روایت رہی ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتا ہے اور قرآن کی تعلیمات کے منافی ہر اقدام کی بروقت گرفت کرنا اس کا وطیرہ رہا ہے۔ چنانچہ اس اہم موضوع پر مدیرِ طلوعِ اسلام نے تمام قارئینِ طلوعِ اسلام کو دعوتِ فکر و اظہار دے دی جس کے جواب میں کوہ مری سے ملک حنیف وجدانی صاحب نے بڑا معلوماتی اور تحقیقاتی مضمون بغرضِ اشاعت ارسال کیا جو گذشتہ ماہ سے بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ اس کی دوسری قسط ہے جس میں اسلامی ریاست چلانے والوں کے علم و عمل کے حوالہ سے تاریخِ اسلام کا جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں وفاقی شرعی عدالت سے آٹھ نکاتی درخواست کی گئی ہے جس کی سب سے اہم شق یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سیاسی پارٹی بازی کو جو پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ہے، بالکل ممنوع قرار دیا جائے کیونکہ اس نے اخلاقی اور مالی دیوالیہ پن پیدا کر دیا ہے۔ مضمون ابھی جاری ہے اور اس کی اقساط باقی ہیں۔ اس مضمون میں جن اہم معلومات کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے وہ تاریخ کے اس تسلسل کی کہانی ہے کہ فرقے کب اور کس طرح بنے؟ احادیث کیوں، کب اور کس طرح بنائی گئیں؟ جامعینِ احادیث کون کون لوگ تھے؟ اسلام میں اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت کب اور کیوں محسوس ہوئی؟ مجتہدین کون تھے اور پاکستان کی پارلیمنٹ میں کون کون سی سیاسی پارٹیاں سرگرمِ عمل ہیں اور یہ سب اپنے تشخص کو منوانے کے لئے پارلیمنٹ اور سینٹ میں کیا طریق کار اختیار کر رہی ہیں؟

● — پیٹ کی آگ

محترم عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ، تحریکِ طلوعِ اسلام کے بالغ نظر مفکر اور دانشور ہیں اور بات کو سلیقے سے سمجھانے کا فن جانتے ہیں۔ اس مضمون میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ کائنات کی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ پیٹ نہ لگا ہو۔ ان میں سب سے بڑا پیٹ انسان کا ہے جو کسی صورت بھرتا

ہی نہیں ہے۔ یہ انسان سب کچھ پیٹ میں ڈال کر بھی کہتا ہے هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ' لا اور بھی لے آ (لا تناہی چلا جاتا انسان کی ہوس کا یہ پیٹ اسے خود غرض بناتا چلا جاتا ہے، وہ جائز و ناجائز، ہر طریقے سے مال و دولت اور ذرائع پیداوار کو اپنے قبضہ میں کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح انسانوں میں امتیازات اور طبقاتی تقسیم کی جڑیں مضبوط و مستحکم ہوتی جاتی ہیں۔ جس سے انسانیت نڈھال اور قدریں پامال ہوتی ہیں ـــــ قرآن کے متعدد حوالوں سے عبداللہ ثانی صاحب نے بتایا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس سے کیونکر بچا جا سکتا ہے ـــــ یعنی اس کا صحیح قرآنی حل کیا ہے اور ہم اس کے مضرت رساں نتائج سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔

• ـــــ وہ ماحول کہاں ہے؟

ملک میں ٹریفک کے بڑھتے ہوئے حادثات کو روکنے کے لئے وفاقی شرعی عدالت کی سفارش وایما پر قصاص اور دیت کے قانون کا نفاذ ہوا، تو پاکستان کا ڈرائیور طبقہ لرز اٹھا کیونکہ اس آرڈی ننس کی رُو سے ٹریفک کے حادثہ میں ہلاک ہونے والے کی ذمہ داری ڈرائیور پر ڈال دی گئی تھی اور اس کے لئے دیت کی رقم ایک لاکھ ستر ہزار روپے اور سزا دس سال قید رکھی گئی تھی۔ چنانچہ ڈرائیورز نے ہڑتال کر دی اور قصاص اور دیت کے قانون کو حکومت نے واپس لے لیا اور نظرثانی کے لئے نظریاتی کونسل کے سپرد کر دیا۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ اور قصاص و دیت کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے ڈنمارک سے محمد اسلم رانا صاحب نے بات کو آگے بڑھایا ہے ـــــ ان کا یہ مضمون یا تو جنگ لندن میں پہلے چھپ چکا ہے یا جنگ لندن میں چھپے ہوئے مضمون کو انہوں نے قارئین طلوعِ اسلام کے استفادہ کے لئے بغرضِ اشاعت ارسال کیا ہے کیونکہ بات واضح نہیں ہو سکی ہے۔ سرِ عنوان مضمون نگار کا نام محمد اسلم رانا تحریر ہے اور مضمون کے اختتام پر "بشکریہ جنگ لندن" لکھا ہے۔

• ـــــ تغیرِ نفس

مس صالحہ لطمی کنیئرڈ کالج لاہور میں شماریات کے شعبہ کی صدر ہیں۔ بات کو نہایت سادہ انداز میں پیش کر کے ریاضی کے سوالوں کی طرح ان کا صحیح منطقی اور حتمی جواب یا حل پیش کرنے کا فن جانتی ہیں۔ تغیرِ نفس اپنی نوعیت کا واحد مضمون تھا جو طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن میں پڑھا گیا ـــــ یعنی اس میں نہ تو قرآنی مفاہیم یا مسائل کے حوالے سے کوئی بات کی گئی تھی اور نہ اسلام اور غیر اسلامی طرزِ معاشرت سے بحث کی گئی تھی ـــــ بلکہ اس کا تعلق براہِ راست ہمارے نظامِ تعلیم، طریقِ تعلیم، نصابِ تعلیم اور استاد شاگرد کے رشتے یا COMMUNICATION سے تھا۔ ہمارے درسی ادارے کیسے ہوتے ہیں۔ کلاس روم کا مجموعی نقشہ کس طرح کا ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر پیش کئے جانے والے دستاویزی اور سائنسی پروگرام اور غیر ملکی رسالوں میں پائے جانے والے مضامین کا معیار کس طرح طالب علم کی سوچ پر اثر انداز ہوتا ہے ـــــ استاد کو کیا ہونا چاہیئے اور وہ کیا رول ادا کرتا ہے۔ نصابی کتب اور لائبریریز کیا مقام رکھتی ہیں اور ایک استاد اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کر کے کس قسم کا تعلیمی انقلاب برپا کر سکتا ہے، اس کا نفسِ مضمون ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک بہت ہی اہم، ماہرانہ اور دانشورانہ سوچ کا حامل مضمون ہے لیکن کنونشن میں پیش کئے جانے والے مضامین کا دائرہ اگر تحریک اور فکرِ قرآنی یا اس سے

متعلق مسائل تک ہی محدود رکھا جائے، تو مناسب لگتا ہے ـــــ اس مضمون سے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو بہرحال استفادہ کرنا چاہیئے۔

● ـــ میرے تصوّر کا پاکستان مس شاہدہ ندیم طالبہ ایم اے سیاسیات لاہور کالج برائے خواتین کا وہ مضمون جو انہوں نے کنونشن میں پڑھا اور ججوں کے فیصلے کے مطابق انعامی مقابلہ میں جسے بہترین قرار دیا گیا اور جس پر مس شاہدہ کو مبلغ ایک ہزار روپے دیگر تحائف کے ساتھ پیش کئے گئے۔ نئی نسل پاکستان کو کیسا دیکھنا چاہتی ہے؟ وہ تصوّرِ پاکستان کے بنیادی مقاصد سے کس قدر قریب یا بعید تر ہے؟ اور وہ تصوّر کس طرح حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے؟ اسی کی حسین تفصیل اس کا متن ہے۔

● ـــ انسانم آرزوست یہ اس خطبۂ استقبالیہ کا عنوان ہے جو ناظمِ ادارہ محمد لطیف چوہدری صاحب نے طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۹۱ء میں ملک کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے اور مقامی بزموں کے نمائندگان کے سامنے پیش کیا ـــ یہ مضمون دراصل طلوعِ اسلام کی کنونشنوں میں پیش کئے گئے باباجیؒ (علامہ پرویزؒ) صاحب کے خطابات سے اخذ کردہ اقتباسات پر مشتمل ایک منفرد اور مستحسن کاوش تھی۔ یہ وہ تمام اقتباسات ہیں جن میں کسی نہ کسی اعتبار اور حوالہ سے علامہ مرحوم نے کاروانِ تحریک کے ساتھیوں سے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے پر زور دیا تھا اور کہا تھا کہ "یاد رکھیئے! آپ کی تحریک محض ایک تنظیم کا نام نہیں، یہ دل و نگاہ کی تبدیلی کی تحریک ہے، یہ صرف قرآنی تصوّرات کو ذہنی طور پر سمجھ لینے کی تحریک نہیں بلکہ یہ ان تصوّرات کے مطابق اپنے اندر انقلاب پیدا کرنے کی تحریک ہے اگر آپ کے اندر اس قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہو رہا، تو پھر آپ کی تحریک سے وابستگی نہ آپ کے لئے مفید ہے نہ آپ کا وجود تحریک کے لئے مفید۔"

محمد لطیف چوہدری صاحب نے اس خطبۂ استقبالیہ کے ذریعہ سے تحریک کے مقاصد واضح کرتے ہوئے ۱۹۹۱ء کو بطور خاص کردار سازی کا سال قرار دینے پر زور دیا ہے اور بڑی دل سوزی کے ساتھ اپنے پیغام میں گذارش کی کہ ہم میں سے ہر فرد سال بھر اپنے آپ کو، اپنی بزم میں، اپنے گھر میں، اپنے گرد و نواح میں، قرآن کے مردِ مومن کے طور پر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کرے۔

● ـــ پیوندی گدڑی بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خان صاحب کا پندرہ صفحات پر مشتمل یہ بلند پایہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں ماضی اور حال دونوں کے حوالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ مذہب اور شریعت کے نام پر مذہبی پیشوائیت اور حکمرانوں نے کس کس طرح اپنے خیالات کے پیوند، احکاماتِ الٰہی میں لگائے گئے ہیں اور اسلام کو انہی پیوندوں کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس پیوندکاری سے دین کو نجات دلانے میں کچھ کوششیں بریگیڈیئر صاحب نے خود بھی کی ہیں اور صدرِ پاکستان کو خطوط کے ذریعے سے توجہ بھی دلائی ہے۔ اس کے حوالے بلکہ وہ خط و کتابت بھی اس مضمون کا حصّہ ہے۔ طویل مضمون کے آخر میں بریگیڈیئر صاحب نے دو ٹوک انداز میں تحریر کیا ہے کہ

"اگر ہم پیوندی گدڑی اتارنے کے آرزومند ہیں، تو ہمیں مومن بننے کی آرزو کرنی ہوگی کہ یہی مشیتِ الٰہی ہے یعنی مروجہ مذہب کو پھر سے دین میں تبدیل کرنے کے لئے ہمیں اپنے اندر وہ فکری اور قلبی تبدیلی پیدا کرنی ہوگی جسے قرآن نفسیاتی تغیر سے تعبیر کرتا ہے (۱۳/۱۱) اس تغیرِ نفس کے بغیر مسلمانانِ عالم کی موجودہ ابتر حالت بدل نہیں سکتی، ہرگز ہرگز بدل نہیں سکتی چاہے ہم کچھ بھی کرلیں۔"

● — قرآنِ حکیم اور اکیسویں صدی میں عورت کا کردار

قرآنک ریسرچ فاؤنڈیشن اسلام آباد نے اپنے پہلے انٹرنیشنل سیمینار میں مقالہ پیش کرنے کے لئے طلوعِ اسلام کی مدیر معاون محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ کو بھی دعوت دی۔ چنانچہ یہ مقالہ اسی سیمینار کے لئے لکھا گیا تھا جسے طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ تیرہ صفحات پر مشتمل اس مقالہ میں محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ نے قرآنِ حکیم کے آئینے میں عورت کے مقام پر بڑی شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے — ماضی میں عورت کو کیا سمجھا گیا؟ — عیسائیت نے اس کا تصور کیا پیش کیا؟ مذاہبِ عالم میں وہ کیا نظر آئی؟ — دنیا کے سماج میں اس کی کیا حیثیت متعین ہوئی؟ مذہبی پیشوائیت نے اسے کہاں پہنچا دیا؟ اور قرآن نے اسے عظمت و رفعت کی کس بلند سطح پر رکھا — یہی اس مقالہ کے مندرجات ہیں۔ اس مقالہ کی افادیت و اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہی مقالہ نومبر کے طلوعِ اسلام میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ بھی شائع کیا گیا ہے اور حال ہی میں شائع ہونے والی "عورتوں کا انسائیکلوپیڈیا" "رونا چھوڑیئے جینا شروع کیجئے" (مرتبہ مسز جان فردوس و مس ریحانہ فردوس) میں بھی طلوعِ اسلام کے حوالے سے مکمل طور پر شائع ہوا ہے۔

● — قانونِ مکافاتِ عمل

بشیر احمد عابد صاحب جب ریاض (سعودی عرب) میں بزمِ طلوعِ اسلام کے نمائندہ تھے اور ازاں بعد جب کویت چلے گئے تھے تب بھی اور اب جبکہ واپس پاکستان آ چکے ہیں اور کراچی میں بزم کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں تب بھی قارئینِ طلوعِ اسلام کے لئے مستقل طور پر قرآن کے کچھ نہ کچھ حقائق منکشف کرتے رہتے ہیں۔ دس صفحہ کے اپنے اس مضمون میں انہوں نے انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو کو سمیٹتے ہوئے یہ بتانے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ ہمارے خارج اور ہمارے داخل میں صرف اور صرف اللہ کے قوانین کی کارفرمائی ہے — خارجی کائنات تو ان قوانین پر چلنے کے لئے مجبور ہے لیکن انسان کو اختیار و ارادہ کی نعمت سے نواز دیا گیا ہے اور اس کے اعمال کی ذمہ داری خود اس کی اپنی ہے، وہ آزاد ہے چاہے تو اپنے لئے جنت کا انتخاب کرلے چاہے دوزخ کو قبول کرلے، اللہ اس کے اختیار و عمل میں مزاحم نہیں ہوگا لیکن اللہ نے ہر عمل میں اس کا نتیجہ بھی ساتھ ہی رکھ دیا ہے جو عمل کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اچھے عمل کا اچھا نتیجہ۔ بُرے عمل کا بُرا نتیجہ — اعمال کا نتیجہ رک نہیں سکتا۔ کسی طور نہ رُک سکتا ہے نہ روکا جا سکتا ہے — مر بھی جائے تو انسان کے مرنے کے بعد اس نتیجہ کو بھگتنا ہوتا ہے یہی قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور دین کی ساری بنیاد اسی ایک قانون پر ہے۔

● فریضۂ رسالت

علی محمد چدھڑ صاحب نے قرآنِ کریم کی ایک حسین ہدایت کی طرف اپنے مضمون کی وساطت سے قارئین طلوعِ اسلام کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "..... اے جماعتِ مومنین تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم قوانینِ الٰہی کو خود بھی اپنے سامنے رکھو اور ان کا چرچا بھی کرو اور ان قوانین کے نفاذ کے لئے رات دن سعی و عمل میں سرگرداں رہو (۴۲-۴۱/۴۳)۔ علی محمد صاحب نے اپنے مضمون میں جہاں اس کی اہمیت واضح کی اور مختلف قرآنی حوالوں سے اسے اختیار کرنے پر زور دیا (بطور حوالہ امام خمینی کا خط بنام سربراہ روس بمطابق ۴؍ فروری ۱۹۸۹ء) وہاں ایک افسوسناک پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم فریضۂ رسالت اس طرح ادا کرتے ہیں کہ جب بھی موقع ملتا ہے دنیا کے سامنے قرآنِ خالص پیش کرنے کے بجائے فقہ اور روایات پر مبنی مواد دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے اسلام کے متعلق شکوک و شبہات اور طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور قرآن نظروں کے سامنے آنے ہی نہیں پاتا۔

● طلوعِ اسلام

دو صفحات پر مشتمل جناب سراج منیر صاحب کا یہ مضمون اُردو انشا پردازی کا خوبصورت نمونہ ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں لکھا گیا اور شائع ہوا تھا۔ قندِ مکرر کے طور پر اس شمارہ کی زینت بنا ہے۔ اس میں انہوں نے "مجلہ طلوعِ اسلام" سے خطاب کیا ہے کہ "ہم نے تیرے مقصد و مسلک کو جانا، قرآن کی کسوٹی پر پرکھا اور احسن پایا، تُو نظامِ ربوبیت کا پیامبر ہے...... ہم اس انقلاب کے نقیب ہیں، ہماری نگاہیں یہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں کہ کب زندگی اپنے خوابِ جمود سے انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اور اپنے جمال و کمال سے دنیا کو منور اور آسودہ کر دیتی ہے ...... تُو نے ہماری مچلتی آرزوؤں کو دیکھا۔ اب تُو ہی بتا کہ ہم کس نظم سے آگے بڑھیں، کس کس کو اور کیا کیا ساتھ لے کر چلیں۔"

● HOUSE OR HOME

ماہرِ تعلیم، کینیئرڈ کالج لاہور کی سابق استاد اور تحریکِ طلوعِ اسلام کی دیرینہ رفیق، جنہیں علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب سے براہِ راست مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ انہی دانشور مس شمیم انور کا انگریزی زبان کا مقالہ ہے۔ اپنے مقالہ میں مس شمیم انور نے ازدواجی زندگی کے اہم ترین پہلو کو موضوع بنایا ہے جسے ہم خاندان یا گھرانہ کہہ سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اینٹ پتھر سیمنٹ، چونے اور لکڑی سے بنائی ہوئی عمارت، گھر کہلا سکتی ہے یا ہم اسے گھر سے تعبیر کریں گے جہاں کے افرادِ خانہ آزادی سے، محبت و اعتماد سے، بے خوفی سے رہتے ہوں اور ایک دوسرے کے دل اور سوچیں آپس میں جڑی اور گوندھی ہوئی ہوں؟ اور یہی آج کے انسانی معاشرہ کی دکھتی رگ یا سلگتا ہوا احساس ہے جس نے مس شمیم انور کے قلبِ حساس کو دعوتِ فکر دی ۔۔۔ اپنے چار صفحے کے مضمون میں مختلف حقائق اور تاریخی حوالوں سے مس شمیم نے اسی سوال کا جواب دیا ہے اور آج کے پاکستانی معاشرے کی زبوں حالی، عدمِ اعتماد، ویرانہ خانی، قیادت کا فقدان، دانش و تحقیق کا عنقا ہونا اور عوام الناس کا استحصال اور

اقدارِ حیات و تہذیب کے زوال کا سبب صرف اور صرف یہ بتایا ہے کہ ہم گھر تو تعمیر کرتے چلے جا رہے ہیں لیکن گھرانوں کی تشکیل سے غافل ہو گئے ہیں ــــ

● ــ **قوم کے منتخب نمائندوں (ارکانِ پارلیمنٹ) کا احسانِ عظیم** | عنوان کی درازیٔ قد، محمد عمر دراز صاحب کے اس مختصر سے مضمون کے لئے بہت زیادہ ہے ــــ مضمون کا پورا عنوان ہے: "قوم کے منتخب نمائندوں (ارکانِ پارلیمنٹ) کا احسانِ عظیم۔ انہوں نے قوم کا اللہ اور اس کے رسولؐ سے ہر رشتہ منقطع کر دیا ہے!" اس مضمون میں عمر دراز صاحب نے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے تحریکِ حصولِ پاکستان کے دوران اسلامی مملکت کا تصور کیا پیش کیا تھا اور اس تصور کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے کن ارشادات کے اتباع میں تھی۔ پھر ارکانِ پارلیمنٹ یعنی قوم کے منتخب نمائندوں کے "کارنامے" بیان کئے ہیں جن میں سب سے بڑا "کارنامہ" ان کا شرعی بل ہے جس کی شق نمبر ۲ اور ۳ قطعاً غیر قرآنی ہے جن کی رُو سے مسلمانوں کی فرقوں میں تقسیم کو جائز اور قانونی حیثیت میں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ تقسیم شرک قرار پاتی ہے۔ اسی طرح قرآن و سنت کو جسے مسلمانوں کے معاملات میں فیصلہ کرنے والی آخری اتھارٹی ہونا چاہیئے تھا، انسانوں کے ایک گروہ یعنی ان فرقوں کے فقہاء کی تشریح و توضیح کے تابع کر دیا گیا ہے۔

● ــ **نسخۂ کیمیا** | "خوبصورتی، امن، صحت، رعنائی، حسن، کشش، خوشی، سکون، میٹھی نیند وہ انمول چیزیں ہیں جو دنیا کے کسی بازار میں نہیں بکتیں اور کسی کرنسی سے نہیں خریدی جا سکتیں۔ یہ سب کچھ انسان کے اندر ہی ہوتا ہے۔ ہر شخص اس خزانے سے مالا مال ہے۔ ان نعمتوں اور رحمتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہر فردِ بشر کے پیکر میں شب و روز موجزن ہے جو چاہے اس سے بہرہ مندی کے جواہر نکال لے، جو چاہے آنکھیں بند کئے قسمت کو کوستا رہے اور محروم و مغموم مر جائے۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس سے آگاہ کس طرح ہوں اور اس سے استفادہ کیسے کریں؟"

یہ اقتباس راقم (قاسم نوری) کے اس مضمون سے ہی لیا گیا ہے ــــ اور اس کے بعد قرآنِ کریم کے مختلف حوالوں سے اسی سوال کا جواب بالفاظِ دیگر اسی نسخۂ کیمیا کا راز بتایا گیا ہے ــــ یہ مضمون ایک بڑی ریسرچ کی حیثیت رکھتا ہے اور متعدد رسالوں نے اسے کاپی کیا ہے۔

● ــ **جہاں مارکس ناکام رہ گیا (لمعات)** | روس میں ستر سال پہلے کا اشتراکی نظام اپنی بنیادوں پر لرز رہا ہے۔ گرا کہ گرا۔ چنانچہ اس شمارہ کے "لمعات" میں اسی کو موضوع بنایا گیا ہے اور 'سرِ لمعات' تمہیدان الفاظ سے اٹھائی ہے۔

"روس میں اشتراکی نظام کی بنیاد ایک طرف ہیگل کا وہ فلسفہ ہے جسے مارکس نے آگے بڑھایا اور دوسری طرف وہ معاشی نظام ہے جسے لینن نے وضع کیا اور اسٹالن اور اس کے ساتھیوں نے نافذ کیا۔ مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی نگہِ بصیرت نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ خدا کی نفی اور جذبۂ محرکہ کا فقدان، جلد یا بدیر اس نظام کو لے ڈوبے گا اور وہی ہوا۔

(سلیم کے نام خطوط، جلد اوّل ۱۹۴۹ء)

اپنی بصیرتِ قرآنی کی بدولت انہوں نے اشتراکی دنیا کو اس نظام کے مضمرات سے آگاہ کرتے ہوئے یہ نوید بھی سنائی تھی کہ وحیٔ خداوندی جس نظام کی بشارت دیتی ہے وہ انسان کو اس مقام سے آگے لے جاتا ہے جہاں مارکس ناکام رہ گیا۔ مفکرِ قرآن کا یہ مقالہ قارئین کے استفادہ کے لئے بارِ دگر پیش کیا جا رہا ہے۔"

•— نئی لکھنے والی بیٹیاں

• مس شاہدہ ندیم

• وہ قلم کار ساتھی جنہوں نے ۱۹۹۱ء میں ماہنامہ طلوعِ اسلام میں مضامین لکھے۔

(۱) محترمہ ثریا عندلیب (۲) محترمہ شمیم انور (۳) محترمہ سلطانہ عاصمی (۴) محترمہ صالحہ نغمی (۵) محترمہ سلمٰی لطیف (۶) محترمہ مدینہ صادق (۷) محترمہ فرخندہ اعزاز (۸) محترمہ شاہدہ ندیم (۹) محمد قاسم نوری (۱۰) بشیر احمد عابد (۱۱) محمد حنیف وجدانی (۱۲) رانا محمد اسلم (۱۳) محمد عمر دراز (۱۴) محمد لطیف چوہدری (۱۵) بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خان (۱۶) عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ (۱۷) غلام رسول ازہر (۱۸) سید عبدالودود (۱۹) محمد علی بیگ (۲۰) محمد ارشاد (۲۱) علی محمد چدھڑ (۲۲) پروفیسر حسنین کاظمی (۲۳) پروفیسر رفیع اللہ شہاب (۲۴) حسین امیر فرہاد (۲۵) محمد اشرف ظفر (۲۶) جنرل احسان الحق (۲۷) عزیز القاسمی (۲۸) خواجہ ازہر عباس (۲۹) اے آر خان (۳۰) اشتیاق احمد (۳۱) محمد قاسم خاں (۳۲) علامہ اسلم جیراجپوری (۳۳) ڈاکٹر ایم ایس ناز اور جناب علامہ غلام احمد پرویزؒ کی تحریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔

•— وہ ساتھی جو ۱۹۹۱ء میں ہم سے بچھڑ گئے۔

(۱) شیخ عبدالحمید۔ مفکرِ قرآن علامہ پرویزؒ صاحب کے رفیقِ دیرینہ اور معتمدِ خاص، انتقال ۲۷ دسمبر ۱۹۹۰ء کو ہوا۔ خبر جنوری ۱۹۹۱ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔

(۲) اہلیہ صوفی محمد نذیر احمد ۲۸ مارچ ۹۱ء، و اہلیہ ڈاکٹر سید عبدالودود۔

(۳) عبدالغفور، بزمِ طلوعِ اسلام سرگودھا کے فعال رکن تھے۔

(۴) ڈاکٹر عبدالرحمٰن ہاشمی (ٹنڈو آدم) ۹ اکتوبر ۱۹۹۱ء، طلوعِ اسلام کے پرانے قاری اور تحریک کے شیدائی تھے۔

● — وہ ادارے اور اشتہارات جو سال ۹۱ء میں طلوعِ اسلام کے مالی استحکام کا سبب بنے۔

۱۔ شاہ محمد اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ملتان، برائے شہاب کوالٹی پسٹن رنگس SHAHAB QUALITY PISTON RINGS.

۲۔ النور پرنٹرز و پبلشرز، ملتان روڈ لاہور برائے مطبوعات "دولتِ پرویز"۔

۳۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور برائے مطبوعات۔

۴۔ عروج اکیڈمی، پنڈی پوائنٹ مری، برائے "تین کتابیں" قرآنی انقلاب کیسے آئے گا؟، رونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے اور غلام احمد پرویزؒ (ایک تعارف)۔

● — اور اب آخر میں ایک اہم بات۔

کوئی بھی تحریک، مقصد یا کام ہو، اس وقت تک منزل آشنا نہیں ہوتا اور عروج پذیرائی حاصل نہیں کرتا جب تک اس کام کے کرنے والوں میں جوش و جذبہ اور والہانہ لگن، جنون کی حد تک نہ ہو اور ذاتی اغراض و مفادات کے بجائے تحریک یا مقصد کا احساس رگ و ریشۂ فکر و عمل میں نہ دوڑنے لگے۔ طلوعِ اسلام کی مجلس ادارت میں جو لوگ شامل ہیں، ان کے جذبہ اور تحریک کے لئے ان کی تڑپ کا اعتراف نہ کرنا، ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ اور جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب نے کسی تنخواہ، کسی معاوضہ اور کسی لالچ کے بغیر جس طرح پورے سال تعاون کیا وہ لائقِ تحسین ہے۔ اسی طرح جناب محمد لطیف چوہدری صاحب نے جس جذبہ و جنون کے ساتھ شب و روز نہ صرف مجلّہ طلوعِ اسلام کی ادارت کی ذمہ داریاں نبھائیں بلکہ طلوعِ اسلام کنونشن کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں — اندرون و بیرون ملک بزم ہائے طلوعِ اسلام کے معاملات کو بھی نبٹایا اور ادارے کی نظامت کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیئے۔ رابطہ باہمی مراسلت، ادارے میں آنے والوں کی الجھنوں اور سوالوں کے جوابات، مضمون نگاروں سے نگارشات کا حصول، کتابت کرانا، پروف ریڈنگ کرنا، "کمپیوٹرنگ" کرنا اور احباب کو مطمئن کرنا کچھ آسان مراحل نہیں ہوتے — چوہدری محمد لطیف صاحب کا لختِ جگر ایک حادثہ میں شدید زخمی ہو کر مہینوں ہسپتال میں پڑا رہا — نڑپتا رہا لیکن ایسی حالت میں بھی وہ دفتری امور سنبھالے رہے اور تحریک کے مقاصد ان کے اعصاب پر سوار رہے۔ اس جذبے اور احساس کے لئے وہ لائقِ صد تحسین و تشکر ہیں۔ (قاسم نوری)

قرآن کے حقوقِ اشاعت

وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد میں دائر کردہ جناب عبداللہ ثانی/صاحبزادہ سکندر ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر بشیر الحق صاحب کی درخواست۔

بعدالت فیڈرل شریعت کورٹ، اسلام آباد

۱۔ عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ پشاور
۲۔ صاحبزادہ سکندر ایڈووکیٹ پشاور
۳۔ ڈاکٹر بشیر الحق افغان کالونی پشاور

بنام سیکرٹری وزارت قانون و انصاف، پاکستان۔ اسلام آباد

درخواست زیر آرٹیکل ۵ ـ ۲،۳ آیئن پاکستان ۱۹۷۳ء جس کی رُو سے کاپی رائٹ آرڈی نینس ۱۹۶۲ء کے دفعات ۳(۱)(a)، ۲(۱۷)، ۴(a)، ۱۳(a)، ۱۴، ۳۵، ۳۷، ۵۰، ۶۰، ۶۶ اور ۱۹۶۷ء RULES کے دفعات ۱۰، ۱۷ جس پر عدالتیں عمل درآمد بھی کرتی ہیں، قرآنِ کریم کی تعلیمات کے یکسر خلاف ہیں اس لئے قابلِ تنسیخ اور ناقابلِ عمل ہیں۔

استدعا:۔ بمنظوری درخواست ہذا مندرجہ بالا جملہ دفعات کو جوں کا توں بھی رکھا جا سکتا ہے اگر

(ا) محولہ آرڈی نینس کی ابتدائی تعریفات میں (f) (5) اور (P) میں صرف لفظ RELIGION کو خارج کر دیا جائے یا اس کی وضاحت کر دی جائے۔

(ب) بعد از منظوری درخواست ہٰذا قرآنِ کریم سے متعلق جُملہ حقوق پر ادا ہونے والی رائلٹی یا ہر قسم کی ادائیگی ختم کی جائے اور عدالت حضور مناسب وقت کے بعد ادائیگی بند کرنے کا حکم صادر فرما دے حالانکہ اس میں مہلت دینا بھی خلافِ قرآن ہے۔

جناب عالی! سائلان حسبِ ذیل عرض رساں ہیں۔

۱۔ یہ کہ سائلان قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نیز بنی نوع انسان کے نام آخری پیغام کے ساتھ ساتھ سرچشمۂ قوانین و ہدایات صمیم قلب سے تسلیم کرتے ہیں۔

۲۔ یہ کہ قرآنِ کریم کا مصنف کسی صورت میں بھی انسان نہیں ہے۔ اس لئے اس کے حقوق یا جملہ حقوق کسی انسان کے حق میں محفوظ نہیں کئے جا سکتے اور نہ ہی حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں کوئی اُدارہ، کوئی حکومت یا انسانی عدالت اس قسم کا کوئی لائسنس/سرٹیفکیٹ جاری کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کی اشاعت پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا تعلیماتِ قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ سورۃ مائدہ آیت ۶۷۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر ایسا نہ کیا تو تم نے رسالت کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ تم اُن لوگوں کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ اللہ تمہارے کام کو مخالفین کی شر انگیزیوں سے محفوظ رکھے۔ بے شک اللہ تعالیٰ انکار کرنے والوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

یہ حکم حضور صلعم کو دیا گیا ہے اور اُن سے امتِ مسلمہ کو یہ فریضہ حوالہ ہوا ہے۔ اس وجہ سے قرآن کریم کو بَلٰغٌ لِّلنَّاس (۱۴/۵۲) کہا ہے یعنی وہ ذریعہ جس سے انسانیت اپنے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا۔

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۱۰۶)

یہ اساسی قانونِ حیات ہر اس قوم کے لئے دور رس حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے جو ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے

پھر فرمایا:۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۱۶/۳۵)

رسولوں کے ذمے تو اتنا ہی ہے کہ جو وحی انہیں دی جائے اسے واضح طور پر لوگوں تک پہنچا دیں۔

اب اگر حقوق محفوظ ہی ہونا مقصود ہوتے، تو سب سے پہلے رسولؐ ان حقوق کے محفوظ کرنے کے مستحق قرار پاتے۔ یہ سلسلہ رسولوں کے ذریعے اور پھر حضورؐ سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔

(دیگر آیات بحث میں پیش کی جائیں گی)

۳۔ یہ کہ چونکہ قرآن کریم قیامت تک ہر زمانے اور انسانوں کے لئے سرچشمۂ رشد و ہدایت ہے اس لئے اس کے تراجم یا مفاہیم کو کوئی بھی شخص پیش تو کر سکتا ہے لیکن اپنے حق میں محفوظ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان تراجم یا مفاہیم کے

حقوق کسی مصنف کے حق میں محفوظ اس لئے نہیں ہو سکتے کہ کوئی بھی انسان قرآنِ کریم کا مصنف نہیں ہے اور اگر ایسا کیا گیا، تو یہ تعلیمات قرآن کے خلاف فعل ہے کہ قرآنِ کریم ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ ہے اور حضورؐ کے لئے فرمایا گیا کہ

وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۲/۱۰۴)

اے رسول! تو ان سے اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں مانگتا، بلا مزد و معاوضہ ان کی بھلائی کے لئے اس قدر کوشش کر رہا ہے۔ یہ تو تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔

یہ کہ قرآنِ کریم کی آیات کو فروخت کرنا یا اس کے ذریعہ کسی قسم کی رائلٹی وصول کرنے یا دینے کو اللہ تعالیٰ نے اچھا نہیں سمجھا ہے۔ بلکہ ایسا کرنے والوں کو خوف دلایا گیا ہے۔ اس لئے محولہ آرڈی ننس میں وہ دفعات جو رائلٹی کے زمرہ میں آتی ہیں تعلیماتِ قرآن کے خلاف ہیں۔ ارشادِ ربی ہے:۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۔ (۲/۴۱)

میری آیات کو قلیل رقم کے عوض مت بیچو اور میرے غضب سے بچو۔

۔ یہ کہ حضور صلعم کی بعثت سے قبل یہود و نصاریٰ نے مذہب پیشہ ور لوگوں کے حوالہ کر دیا تھا اور مذہب سے متعلق پوچھ گچھ صرف مذہبی پیشوائیت سے کی جاتی تھی۔ قرآنِ کریم میں علماء کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک کائناتی علم رکھنے والوں کے لئے اور دوسرا بنی اسرائیل کی مذہبی پیشوائیت کے لئے اور بعد میں مسلمانوں نے بھی یہی سلسلہ شروع کر دیا اور اب مذہبی پیشوائیت ایک پیشہ ور کی حیثیت رکھتی ہے اسے یکسر ختم کرنے کے لئے ارشادِ ربی ہے:۔

(ترجمہ) "ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی، جو مسلم تھے اسی کے مطابق ان یہودی بن جانے والوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی (علماء) اور احبار (فقہاء) بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے۔ کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ پس (اے یہودیو! تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں"

۔ یہ کہ جہاں تک "RELIGION" کا تعلق ہے تو یہ مذہب یا دین دونوں کے معانی میں کسی صورت میں بھی انسانی تخلیق کے زمرے میں نہیں آتا (مذہب کا لفظ قرآنِ کریم میں موجود نہیں لیکن اصطلاحی معنی میں اسلام کو بھی مذہب قرار دے دیا گیا ہے) اس لئے "LITERARY WORK" کی تعریف میں بھی نہیں آسکتا جب کہ محولہ آرڈیننس میں "LITERARY WORK" کی تعریف میں RELIGION کو بھی لایا گیا ہے۔

۷۔ یہ کہ اسی طرح "لکچر" اگر دین یعنی اسلام کے سلسلہ میں دیا گیا ہو یا بالفاظِ دیگر قرآنِ کریم کی آیات کو بنیاد بنایا گیا ہو تو بھی لکچر دینے والے کا اس میں کوئی حق نہیں بنتا کہ وہ اسے اپنی طرف منسوب کر کے اس کے حقوق محفوظ کرائے۔ جہاں تک کسی لکچر دہندہ یا مقرر کی ذاتی کاوشوں کا یا تخلیق کا تعلق ہے، تو اُسے یہ حق محولہ آرڈی ننس کے تحت دیا جا سکتا تھا۔

۸۔ یہ کہ عدالت حضور کو اختیارِ سماعت حاصل ہے۔

لہٰذا استدعا ہے کہ محولہ دفعات کو قرآنِ کریم کی نسبت سے خلاف قرآن قرار دیا جائے اور یا پھر تعریفات میں اس کی وضاحت کر دی جائے کہ کوئی بھی تفسیر/ترجمہ/مفہوم/تفہیم وغیرہ کے حقوق کسی بھی انسان/ادارہ/پبلشرز کے حق میں محفوظ نہیں کرائے جا سکتے اور نہ ہی کسی قسم کی رائلٹی وصول یا ادا کی جائے گی۔

سائیلان عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ۔ صاحبزادہ سکندر ایڈووکیٹ۔ ڈاکٹر بشیر الحق پشاور۔ المرقوم ۱۹۹۲ء/۱

شکیل عثمانی

تعزیت

بیادِ مولانا عمر احمد عثمانی

دسمبر کے ماہنامہ 'فیض الاسلام' سے معلوم ہوا کہ روشن خیال عالمِ دین اور "فقہ القرآن" کے مصنف مولانا عمر احمد عثمانی کراچی میں انتقال فرما گئے۔ مولانا عمر احمد عثمانی ادارۂ فکرِ اسلامی کراچی کے روحِ رواں تھے۔ میں اُن سے اُن کے حلقے کے پنڈی میں مقیم ایک اہلِ علم کے حوالے سے ملا اور ان کی سادگی، خاکساری اور علم دوستی سے بہت متاثر ہوا۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے اپنے فکری سفر میں روشن خیالی کی راہ کس طرح اختیار کی' انہوں نے بتایا کہ مغاہر العلوم سے فراغت کے بعد میں نے فاضل عربی کی تیاری کے لئے دہلی کے مدرسہ فتحپوری میں داخلہ لے لیا، یہ غالباً ۳۷ء یا ۳۸ء کی بات تھی۔ دہلی کے قیام کے دوران مجھے مولانا اسلم جیراجپوری کے درسِ قرآن میں شرکت کا موقع ملا، جو ہر اتوار کو محترم غلام احمد پرویزؒ صاحب کے گھر ہوتا تھا۔ اس طرح پرویزؒ صاحب سے مراسم استوار ہو گئے۔ مولانا نے بتایا کہ مولانا اسلم جیراجپوری اتوار کو صبح پرویزؒ صاحب کے گھر تشریف لے آتے تھے اور تقریباً دن بھر وہیں رہتے تھے۔

مولانا نے بتایا کہ تقسیم کے بعد ان کے والد مولانا ظفر احمد عثمانی نے انہیں مشرقی پاکستان بلوالیا اور وہاں وہ اپنے والد کے حکم پر ضلع چاٹگام کے ایک دارالعلوم سے بطور شیخ الحدیث وابستہ ہو گئے۔ لیکن جب بنگالی زبان کے مسئلے پر مشرقی پاکستان میں فسادات شروع ہوئے، تو مولانا کے والد نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کراچی چلے جائیں۔ واضح رہے کہ چاٹگام کے قیام کے دوران مولانا عمر احمد عثمانی کے حدیث کے موضوع پر چند مضامین ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکے تھے۔ کراچی آنے سے قبل مولانا ظفر احمد عثمانی نے انہیں مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے نام خطوط دیئے تھے کہ ان کی ملازمت کا کوئی انتظام کیا جائے لیکن مولانا کے فرمانے کے مطابق ان بزرگوں نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ مولانا نے بتایا کہ ان کے چاٹگام کے قیام کے دوران محترم پرویزؒ صاحب انہیں لکھتے رہے کہ وہ کراچی آجائیں۔ مولانا کے بقول انہوں نے ملازمت کے سلسلے میں مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا احتشام الحق صاحب کی عدم دلچسپی کو محسوس کر کے جب محترم پرویزؒ صاحب سے ملاقات کی، تو انہوں نے انہیں ادارہ طلوعِ اسلام سے وابستہ ہونے کی پیشکش کی جسے انھوں نے قبول کر لیا، لیکن شرط یہ

رکھی کہ ان کا نام رسالے پر نہیں آئے گا۔ محترم پرویزؒ صاحب نے یہ شرط قبول کر لی اور اس طرح مولانا ادارۂ طلوعِ اسلام سے وابستہ ہو گئے۔

اگرچہ مجھ سے اپنی ملاقاتوں میں مولانا عمر احمد عثمانی نے محترم پرویزؒ صاحب کی فکر کے بارے میں کوئی CATAGORIC رائے نہیں دی (دراصل اس کا کوئی موقع ہی نہیں آیا کیونکہ ہماری گفتگو زیادہ تر اجماع، اجتہاد اور ان کی تصنیف فقہ القرآن کے بارے میں ہوتی تھی) لیکن دو سال قبل ماہنامہ فیض الاسلام میں ان کی ایک تحریر میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ان کی روشن خیالی کا محرک کیا تھا۔ اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ فیض الاسلام میں مولانا عمر احمد عثمانی کی قرآنِ مجید کی تفسیر قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ اواخر ۸۸ء کے کسی شمارے میں انہوں نے "حق" کے وجود کے بارے میں نام لے کر سرسید اور پرویز صاحب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا تھا جس پر انہیں تیز و تند خطوط موصول ہوئے۔ نواب شاہ سے لکھے ہوئے ایسے ہی ایک خط کے جواب میں مولانا عثمانی نے لکھا۔

> "اگر سرسید مرحوم اور مرحوم غلام احمد پرویزؒ کا نام لے کر ان سے اختلاف کرنے سے ناظرین کے نازک جذبات مجروح ہوتے ہیں، تو میں اُن سے معذرت خواہ ہوں۔ میں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ان دونوں حضرات کا میرے دل میں بڑا احترام ہے، میں ان کی تنقیص کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم سرسید احمد خاں امتِ مسلمہ (انڈو پاکستان) کے عظیم محسن ہیں۔ ان کی خدمات بے پایاں اس قدر عظیم ہیں کہ ان سے کوئی شقی ہی صرفِ نظر کر سکتا ہے۔ رہے محترم غلام احمد پرویزؒ صاحب، تو انہوں نے قرآن فہمی کا ایک نیا اسلوب عطا کیا ہے، میں ان کا احترام یقیناً ایک استاد کی طرح کرتا ہوں۔ قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کا اسلوب ہم نے انہی سے سیکھا ہے، میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان کے خلاف لب کشائی کروں لیکن اختلافِ رائے کوئی جرم نہیں۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ اپنے بزرگوں سے اختلاف کیا ہے۔ خود امام یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ نے اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ سے ہزارہا مسائل میں اختلاف کیا ہے اور اس کا کسی نے بُرا نہیں مانا۔"
>
> (ماہنامہ 'فیض الاسلام' راولپنڈی مئی ۸۹ء، ص ۱۵)

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا عمر احمد عثمانی کی زیرِ ترتیب فقہ القرآن کو مکمل کیا جائے اور ان کے مقالات اور مکتوبات شائع کئے جائیں۔ اس خدمت کے لئے نظریں ان کے چھوٹے بھائی مولانا قمر احمد عثمانی کی طرف اُٹھتی ہیں۔

صلاح الدین اکبر

بے خبر تو جوہر آئینہ ایّام ہے

تمام مخلوقات میں انسان ہی اللہ تعالیٰ کی وہ واحد تخلیق ہے جسے اختیار و ارادہ دیا گیا، جسے اپنے متعلق فیصلہ کرنے دیا گیا، غلط نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ واحد آزاد تخلیق ہے۔

مگر تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ واحد آزاد تخلیق ہمیشہ مجبوری اور بےکسی کی زندگی گزارتی رہی، ہمیشہ دوسروں ہی، دوسروں کی محکوم رہی ـــــ

ستم ظریفی یہ کہ محکوم بھی اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی ـــــ انسانیت کی تاریخ، ایک نہ ختم ہونے والی پکار ہے، وہ آسمان کی طرف مُنہ کر کے، پیدا کرنے والے سے مسلسل التجا کر رہا ہے۔

تری دنیا میں، میں محکوم و مجبور

روئے زمین پہ انسان کے قیام کی یہ ساری صدیاں آزادی کی تلاش کا ایک سفر ہے، اس کی ساری جدّوجہد ان زنجیروں سے، ان بندھنوں سے چھٹکارا پانے کی جدّوجہد ہے جن میں وہ خود کو جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے، ایسے وقفے اسے بہت کم ملے جب اسے آزادی نصیب ہوئی ـــــ اور یہ وقفے وہی تھے جب اللہ کے کسی فرستادہ نبی کے لائے ہوئے انقلاب نے اسے تازہ ہوا کا یہ جھونکا مہیا کیا۔

اللہ کی یہ برگزیدہ ہستیاں اس دنیا میں مبعوث ہی اس لئے ہوتی رہیں کہ انسانوں کو ان زنجیروں سے رہائی دلائیں جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں، ان کے سینوں پر سے وہ سلیں ہٹائیں جن کے تلے وہ بلالؓ حبشی کی طرح لیٹنے پر مجبور ہیں تاریخ کے سفر میں یہ وقفے وسیع و عریض صحرا میں نخلستان کی مانند جانفزا اور روح افروز مگر مختصر ہیں۔

قصہ، صاحب ضرب کلیم میں ان زنجیروں کی واضح نشاندہی کر دی گئی ہے۔ ظلم کی ایک تکون ہے جس کی ایک طرف فرعون ہے، دوسری طرف ہامان ہے اور تیسری طرف قارون ـــــ یہ تینوں قوتیں مثلث کی تین اطراف کی طرح جُڑی ہوئی ہیں اور انسان اس پنجرے میں قیدی پنچھی کی طرح بے بس اور مجبور ـــــ

فرعون، ہامان، قارون محض نام ہیں، علامتیں ہیں، مظہر ہیں ان قوتوں کے جن کے ہاتھوں انسان صدیوں سے قید و بند کی صعوبتیں سہتا آرہا ہے ـــــ فرعون ملوکیت کا نمائندہ ہے، ہامان کلیسائیت کا اور قارون سرمایہ داری کا ـــــ اور دیکھا جائے تو یہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھی بلکہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں. مطلق العنان حکمرانوں کا رعب و دبدبہ، رعایا پہ ان کی گرفت اپنے کارندوں اور حاشیہ برداروں کی وجہ سے ہوتا ہے جنہیں رعایا کے سلب و نہب، اُن کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی استحصال کی کھلی چھٹی ہوتی ہے، اس وقت تک کہ وہ حکمران کی وفاداری کا دم اپنی تجوریاں اور اس کا خزانہ بھرتے رہیں۔

جب کبھی پسے ہوئے طبقوں نے ظلم کے خلاف کوئی آواز اٹھائی، تو کلیسائیت کے نمائندے جبہ و دستار، تسبیح و زنار اور نورانی ہیئت کذائی سمیت انہیں سمجھانے اور ڈرانے چلے آتے ہیں، کبھی کہتے ہیں مقدر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے، تقدیر کے خلاف بغاوت، خالق کے خلاف بغاوت ہے اور ایسا تو خیال بھی دل میں لانا گناہ ہے ـــــ راضی برضا رہنا ہی عبد کی معراج ہے اور اس کا آخرت میں بڑا اجر ملے گا، زمین پر زندگی کے یہ چار دن جیسے بھی تقدیر میں ہیں، گزار لو، ابدی زندگی میں بہت کچھ انعامات منتظر ہیں، جو تمہارا ہی حصہ ہیں اور اگر یہاں مشیتِ الٰہی کے خلاف دل میں خیال بھی آیا، تو ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جاؤ گے جو تمہارا انتظار کر رہی ہیں ـــــ

مندر کا پروہت، راج گورو، کلیسا کا پادری، دربار کا مفتی، ایک ہی سکّے کے مختلف رُخ ہیں، راجہ کو بھگوان کا اوتار بنانے کا فریضہ راج یوگی ہی کا کرتوے ہوتا ہے، پادری ہی کنگ ایلپرر کو خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل قرار دیتے ہیں اور مفتی ہی بادشاہ کو ظل اللہ بناتے ہیں ـــ زمین پہ خدا کا سایہ ـــــ

یہ سب ہامان ہی کے مختلف روپ ہیں

سارے سرمایہ دار، سلب و نہب، استحصال کے بل پر لوٹ کھسوٹ کے مرتکب دولت کے انبار پہ بیٹھے سانپ جو اس ساری دولت کو اپنی کاریگری، اپنی صلاحیتوں کا ثمر بتا کر دوسروں کو اس سے محروم کرتے ہیں، قارون نہیں، تو اور کیا ہیں۔

یہ فرعون، یہ ہامان، یہ قارون ہر دور میں رہے ہیں، کل بھی تھے، آج بھی ہیں، آج بھی کل کی طرح ایک دوسرے کے ساتھی، ایک دوسرے کے مددگار ہیں تکون کی تینوں اطراف نے مضبوطی سے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں.

صاحبِ ضربِ کلیم نے انہیں للکارا، تائیدِ خداوندی سے انہیں شکست دی اور بنی اسرائیل کو فرعون، ہامان اور قارون کی غلامی سے نکال کر سینا کی وادیوں میں آزاد زندگی گزارنے کے لئے لے آئے۔

کل بھی صاحبِ ضربِ کلیم کی نسل سے ایک شخص نے پھر ان سے بغاوت کی، ان قوتوں کو للکارا، انسانیت کو ظلم کی چکّی میں پسنے سے بچانے کے لئے سرمایہ دار، استحصالی طبقوں سے نجات دلانے کے لئے زار ہی نے

کلیسا سے بھی بغاوت کی اور اپنی جدوجہد میں کامیاب و کامران رہا ـــــ دنیا میں چاروں طرف کھلبلی مچ گئی، کٹیاؤں میں جشن بپا ہوئے، اونچے ایوانوں میں زلزلے آئے اور لوگ سمجھے کہ انہیں اب آزادی میسر آئے گی، بھوک سے آزادی، خوف سے آزادی، سلب و نہب سے، استحصال سے آزادی، اونچ نیچ کا دور ختم ہوا، مساواتِ انسانیہ کا زمانہ آگیا، ظلم کا سورج غروب ہوا، انصاف کی صبح طلوع ہوئی ـــــ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا، اشتراکی انقلاب شعلۂ مستعجل ثابت ہوا ـــــ ایک عالمگیر جنگ سے تو وہ سرخرو ہو کر نکلا مگر اس کے بعد آدھی صدی بھی نہ گزار سکا اور داخلی محاذ پہ شکست کھا گیا ـــــ

اشتراکی حکومت کی بلند و بالا عمارت جو بظاہر بڑی ہی مضبوط، بڑی ہی پائیدار نظر آتی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اس میں دراڑیں نظر آنے لگیں اور چند ہی سالوں میں یہ ہاؤس آف کارڈز کی طرح بکھر بکھر کر زمین دوز ہوتی نظر آرہی ہے۔ جس معاشی خوشحالی کے نعرے پہ یہ معرضِ وجود میں آئی، آہنی پردہ ہٹا تو نظر آیا وہی مفقود ہے، بدحالی ہے، بے اطمینانی ہے، کام کی اُمنگ نہیں، آپس میں ہم آہنگی نہیں، ایک ریاست دوسری سے باہم دست و گریباں نظر آتی ہے ـــــ اشتراک سراب نظر آرہا ہے، پھر سے ذاتی ملکیت کا دروازہ کھولا جارہا ہے، پھر سے جذبۂ محرکہ کے لئے منافع کا لالچ دیا جارہا ہے اور منافع کے بعد لالچ کے سیلابی دروازے کھلیں گے، اجارہ داریاں قائم ہوں گی، دولت کا ارتکاز ہوگا، پروڈکشن بڑھے گی، کارخانے نظر آئیں گے، (CONSUMER GOODS) استعمال کی چیزوں کی بازار میں کثرت ہوگی، خریداری بڑھے گی، لوگ بظاہر خوشحال ہونے شروع ہوں گے، مزید طلب پیدا کرنے کے ذرائع اختیار کئے جائیں گے، اور مزید خریدار سامنے آتے جائیں گے، ایک چکر چلے گا جس میں انسان کا اطمینانِ قلب پھر گم ہو جائے گا، نئی منڈیاں تلاش کی جائیں گی، اپنے سے کم ترقی یافتہ غریب لوگوں پہ اقتصادی اور اس کے بعد سیاسی غلامی کا جوا پھینکا جائے گا ـــــ یعنی پھر سے وہی سرمایہ داری نظام جس سے چھٹکارا پانے کے لئے بنی اسرائیل کی ایک سعید روح نے زار اور کلیسا سے بغاوت کر کے انسانیت کو مساوات کا راستہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔

اشتراکی طاقت آنکھ سے اوجھل ہوئی، تو سرمایہ دار بلاک دنیا بھر کی حکمرانی کا خواب لئے دندناتا نظر آرہا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے،

اس دنیا میں ہے کوئی ہم سا، ہم سا ہو تو سامنے آئے اور اشتراکیت کے نقیب منہ چھپائے، خجل اور سرنگوں پھر رہے ہیں، قوموں کے منظر سے ہٹ جانے کی یہ ایک نئی تعبیر سامنے آئی ہے ـــــ

خلیج کی غیر مساوی، ظالمانہ جنگ میں سارا سرمایہ دار بلاک تازہ ترین سائنسی ایجادوں کی شعلہ سامانیاں لئے من مانی کر چکا ہے اور روس جو کبھی دوسری بڑی سپر پاور مانا جاتا تھا، جس کے ڈر سے امریکہ کے قصرِ سفید کے کنگرے لرزاں تھے، ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے، کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔

غور طلب بات ہے کہ روس کے نہ ہتھیار ختم ہوئے ہیں، نہ فوج معدوم ہوئی ہے، نہ قوم کی نفری کم ہوئی ہے، صرف یہ ہوا کہ اس کے کھیتوں میں بھوک اگ آئی تھی، انسانوں کے دلوں میں بے چینی، بداعتمادی آگئی، کام کی لگن ختم ہوگئی، مقصد پہ یقین نہ رہا، تو وجود کا مقصد ہی ختم ہوگیا۔

ایسا کیوں ہوا؟ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سپر پاور گھن کھائی لکڑی میں کیسے تبدیل ہوگئی، قوموں کے عروج وزوال کا یہ نیا باب گہری توجہ کا متقاضی ہے۔

یہ تو درست ہے کہ محض مادی ترقی اور قوت کسی قوم کے زوال کے رستے میں آڑے نہیں آئی بلکہ کئی بار اس کے تنزل میں مددگار ہوئی ـــــ قرآن پاک میں جب قریش کو یہ کہا گیا کہ اپنی طاقت پہ گھمنڈ نہ کرو، تم سے پہلے کئی ایسی قومیں ہو گزری ہیں جو تم سے طاقت میں، رعب ودبدبے اور شان وشوکت میں کہیں بڑھ کر تھیں مگر وہ تباہی سے نہ بچ سکیں ـــــ

مارکس اور اس کے متبعین نے پسے ہوئے، کچلے ہوئے طبقوں کی مدد سے غاصبوں اور ظالموں کو شکست تو دی، وقت کے فرعون کو پچھاڑا، وقت کے ہامان کو دھتکارا اور وقت کے قارونوں کو شکست دی ـــــ اور خوش ہوئے، کہا ہم بھی نہیں مانتے، اس کو بھی نہیں مانتے، کسی کو بھی نہیں، نہیں، نہیں۔

لا سلاطین، لا کلیسار، لا الٰہ

چُن چُن کر سب بُت انہوں نے توڑ دئے، دنیا بھر کے محنت کشو متحد ہو کر اپنے حقوق چھین لو، ان کا نعرہ تھا ـــــ اور انہوں نے متحد ہو کر، آگے بڑھ کر سب صاحبانِ اقتدار کا غرور خاک میں ملا دیا اور ان سے حکومت چھین لی ـــــ تاکہ غربت اور مفلسی، محتاجی اور محکومی کا خاتمہ ہو۔

محنت کشوں نے دل لگا کر کام کیا، محنت کی، مضمر صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقعہ ملا اور روس نے سائنس کے میدان میں ترقی کی ایسی منازل تھوڑے ہی عرصے میں طے کیں کہ مغرب چونک پڑا، روس خلائی سائنس میں نہ صرف مغرب کا حریف ہوا، ہم سر ہوا بلکہ کئی میدانوں میں سبقت لے گیا، چاند پر قدم رکھنے والا پہلا انسان روسی تھا۔

ایک طاقت ور روس دنیا بھر کے غریبوں، محنت کشوں اور استحصال کے ماروں کی امیدوں کا مرکز اور سہارا بن کر سامنے آیا، ہر مظلوم نے مدد کے لئے اسی سے آس لگائی۔

مغرب نے جب یہ دیکھا کہ اسے ڈرایا دھمکایا نہیں جا سکتا، تو اس سے بقائے باہمی کے نام پہ سمجھوتہ کر لیا۔

باہمی خوف نے جو سمجھوتہ کرایا وہ بظاہر سرد جنگ کے خاتمے کا سمجھوتہ تھا، کشیدگی کو کم کرنے کا سمجھوتہ تھا مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس نے دنیا پہ تباہی کے رستے کھول دئے اور دونوں نظام ہائے زندگی کی کمزوریاں کھل کر سامنے آنے لگیں پردے ہٹے، تو اصلی چہرے نظر آئے اور ان کا بھیانک پن دیکھ کر انسان چونک اٹھے ـــــ سائنسی میدان میں ترقی کی دُھن

میں روس اپنی آمدنی کا اور اپنی توانائیوں کا اتنا زیادہ حصہ خرچ کر چکا تھا کہ دوسرے میدانوں میں خرچ کرنے کے لئے اس کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ اپنے لوگوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری کر سکتا، رہی سہی کسر افغان جنگ نے پوری کر دی۔

—— اب روس کو روزمرہ کی چیزوں حتیٰ کہ خوراک کی کمی کا مسئلہ درپیش ہوا اور اسے اشیائے خوردنی تک کے لئے اپنے حریفوں، امریکہ اور سرمایہ دار بلاک کی طرف دیکھنا پڑا اور یہ تو مسلّمہ بات ہے کہ جو خوراک کے لئے دوسروں کا محتاج ہو جائے، وہ علم و فضل اور آلاتِ حرب و ضرب کی فراوانی کے باوجود آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا، خجل اور سرنگوں ہو جاتا ہے —— یہی روس کے ساتھ ہوا، اسے جھک کر امریکہ سے سمجھوتہ کرنا پڑا، آہنی پردے ہٹے تو پردے کے پیچھے بند مجبور انسانوں نے پردوں کے دوسری طرف کی رنگین اور بظاہر خوشحال اور شکم سیر دنیا کی جھلک دیکھی تو جبر کی دیوار، دیوارِ برلن کی طرح اپنے ہی ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ گئی، غربت دُور کرنے کا دعویدار نظام اپنے حلقۂ اثر میں رہنے والے انسانوں کی نہ پیٹ کی آگ بجھا سکا اور نہ ہی عزتِ نفس بچا سکا۔

اِدھر مغرب کا سرمایہ دار بھی نئے مخمصے سے دوچار ہوا، باہمی خوف (EQUALITY OF TERROR) کا دَور ختم ہوا تو ہتھیاروں کی صنعت کو بحران کا سامنا تھا، نئے تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری کی اب کیا ضرورت باقی تھی، بلکہ تیار ہتھیاروں کی منڈیاں کہاں تلاش کریں کہ معیشت کو سہارا دینے والی سب سے بڑی صنعت رواں دواں رہے کسی شہنشاہ آریہ میر کے دل و دماغ میں بڑائی کے خناس کو ابھاریں کہ وہ دھڑا دھڑ ملک میں ہتھیاروں کے انبار لگائے اور پھر ان ہتھیاروں سے ڈرا کر کیسے ہمسائیوں میں عدم تحفظ کا احساس ابھاریں اور ہمدرد بن کر انہیں بھی ایسے نئے نئے ہتھیار سپلائی کریں جو ان کے فوجی استعمال بھی نہ کرنا جانتے ہوں —— اور اس طرح تیل کی بیشتر آمدنی اپنے بنکوں میں جمع کروالیں —— اور تیل سے محروم ملکوں کو یہ ہتھیار قرض میں جکڑنے کے ہتھیار بنا کر دے دئے جائیں اور سود در سود کے چکر میں پھنسا کر انہیں اپنا دستِ نگر اور غلام بنا لیا جائے۔

یہ معاشی غلامی دَورِ حاضر کی نئی ایجاد ہے، جسمانی غلامی اگر عذاب ہے تو یہ عذابِ الیم، ایسا ذلت بھرا عذاب کہ اس کے چکر میں جو آ گیا، گویا اس کا جوڑ جوڑ ہمیشہ کے لئے اس میں بند ھ گیا، جس عذاب میں شرق اوسط اور تیسری دنیا کے ممالک اس وقت گرفتار ہیں وہ انہی شاطر سیاست دانوں کی چال ہے جو اب دنیا بھر کی دولت پہ اجارہ داری حاصل کر کے پوری انسانیت کو اپنی غلامی پہ مجبور کرنا چاہ رہے ہیں، ایک نئے عالمی نظام کی آڑ میں دنیا پہ حکمرانی کی آرزو لئے بیٹھے ہیں، ایک ہی طاقت تھی جو ان کا ہاتھ روک سکتی تھی، وہ خود مفلوج ہے۔

پہلے تو مشرق اور مغرب دو بلاکوں میں دنیا تقسیم کی جاتی رہی، اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں دوسرے کی مداخلت کا امکان دُور کرنے کے لئے بقائے باہمی کا فلسفہ گھڑا گیا، اب تو وہ بھی نہیں رہا، بلا شرکتِ غیرے مغرب ہی مغرب ہے۔

بندر بانٹ تو ہوگی اور یہ بندر بانٹ ہی رقابت کی شکل اختیار کر سکتی ہے مگر ابھی شاید اس کی نوبت نہیں آئے گی عیاّر سیاست دان اس ٹکراؤ کو ٹالنے کے لئے سمجھوتوں کی طرح ڈال کر روزِ بد سے بچنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

تاہم باہمی مفاد اور لالچ کا ٹکراؤ ایک نہ ایک دن تو ہو کر رہے گا۔ ڈاکو ہمیشہ مالِ غنیمت کی تقسیم پہ لڑا کرتے ہیں۔ جب تک سردار طاقت ور ہو، بلا چون و چرا اس کا حکم مانتے ہیں لیکن اس کے کمزور ہونے پہ ہمیشہ آپس میں لڑ کر بکھر جاتے ہیں۔

روس تو بکھر رہا ہے مگر امریکہ کب مسائل سے آزاد ہے، سنتے ہیں بیسیوں بنک فیل ہو چکے ہیں، بیسیوں کا دیوالہ نکلنے والا ہے، ـــــ لوگ تو کہتے ہیں اسی مجبوری کے تحت تو مشرقِ وسطیٰ کی جنگ لڑی گئی ـــــ یہ جنگ کویت کے امیر کی محبت میں نہیں لڑی گئی، عربوں سے امریکہ کو جو دلی لگاؤ ہے، وہ تو فلسطینیوں کی حالتِ زار سے عیاں ہے، نہ ہی یہ جارحیت کو روکنے کے عظیم جذبے سے سرشار حکومتوں کا کارنامہ ہے، دنیا میں اور کس جارحیت کو روکنے کے لئے ایسا قدم اٹھایا گیا ہے ـــــ افغانستان میں بھی جارحیت ہوئی تھی، کشمیر میں بھی تو مظلوم لڑ رہے ہیں، اسرائیل بھی تو دوسروں کی مسلمہ بین الاقوامی حدود کے اندر علاقوں میں قبضہ جمائے بیٹھا ہے، اس کی طرف تو کسی نے اپنی چھوٹی انگلی تک نہیں اٹھائی، یہ کویت اور بالواسطہ شرقِ اوسط کے تیل پہ اجارہ داری کی جنگ تھی جس میں امریکہ نے بہرحال کامیاب ہونا تھا کہ بڑی غیر مساوی جنگ تھی اور اس میں مہذّب دنیا نے اپنی تہذیب کے مُنہ پر کالک مل دی، ـــــ لاکھوں بے گناہ شہریوں کے خون سے ہاتھ رنگے گئے ـــــ محض اس لئے کہ وہ مسلمان تھے، عیسائی یا یہودی نہیں، پچھلی جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پہ بم بھی اس لئے بلا پس و پیش گرائے گئے تھے کہ وہ علاقے جاپان کے تھے جو بہرحال ایک ایشیائی ملک ہے ـــــ جواز یہ کہ ورنہ بہت زیادہ امریکی جانیں ضائع ہونے کا احتمال تھا، کیوں؟ امریکی بلند تر انسانی نسل تو نہیں، بلند تر آریائی نسل کے نام لیوا ہٹلر کو تو آپ نے برداشت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور آج عملی طور پر امریکی بھی وہی کچھ کر رہے ہیں ـــــ اور پھر اس جنگ کے نتیجے میں جو اجارہ داری امریکہ کو حاصل ہوئی ہے اس سے وہ جرمنی اور جاپان کی بڑھتی ہوئی معاشی اور صنعتی جارحیت کے آگے بھی تو بند باندھنا چاہتا ہے۔ دوستوں کی دیکھ بھال کا یہ بھی تو ایک پہلو ہے کہ وہ حد سے زیادہ پھلنے پھولنے نہ پائیں۔

یہ سب روس کی ناکامی کی وجہ سے ہوا؟ کمیونزم کو آخر ہوا کیا کہ وہ ایک صدی بھی پوری نہ کر سکا، جن محنت کشوں مظلوموں کی سربلندی کا نعرہ لگا کر وہ چلا تھا انہیں بیچ منجدھار کے انہی ناخداؤں کے حوالے کر رہا ہے جن سے چھٹکارا دلانے کا اس نے دعویٰ کیا تھا ـــــ اس پہ یہ افتاد کیوں پڑی، مغرب میں کمیونزم کے ناکام ہونے کا بڑا چرچا ہے، فری مارکیٹ، فری انٹرپرائز، ذاتی جائیداد، کیا کیا نہیں کیا جا رہا ـــــ

یہ لوگ کچھ ہی کیوں نہ کہیں اصل بات وہی ہے جس کی طرف فیلسوف مشرق، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اسی

وقت اشارہ کر دیا تھا، جب یہ نظام نجات دہندہ کی صورت سامنے آیا تھا، اس کے حامی بڑے بڑے دعوے اور مخالف بڑے بڑے خدشے ظاہر کر رہے تھے۔

انسان اور انسانیت کی بہتری کے لئے وہ مارکس کے درد و سوزِ آرزومندی کے تو وہ قائل تھے کہ انہوں نے اسے کلیم بے تجلّی اور مسیح بے صلیب کہہ کر پکارا مگر وہ اس کے مبنی بر لا اور وحی کی روشنی سے محروم فلسفہ کے مآل سے واقف تھے، اسے پوچھے بنا نہ رہ سکے۔

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جستہ ای او را اساس محکمے

وہ خوب جانتے تھے کہ

درمیان لا نآساید حیات سوئے اِلّا می خرامد کائنات

جب ہر طرف طاغوت کا غلبہ ہو تو لا کا نعرۂ مستانہ بلند کئے بنا چارہ ہی نہیں ہوتا مگر طاغوت کی شکست کے بعد اِلّا کے بغیر انسانیت کو فلاح کی راہ نہیں مل سکتی۔

لا الٰہ کے بعد الا اللہ ـــــ یکفر بالطّاغوت و یؤمن باللہ ہی وہ متوازن اور مستقیم راہ ہے جس میں انسانیت کی فلاح و بقا ہے۔

لا کے بل پہ مارکس کے فلسفے پہ لینن نے سوشلسٹ نظام کی بنا تو ڈالی مگر وہ جلد ہی سٹالن ازم کی صورت ایک نئے طاغوت، ایک نئے جبر کے آمرانہ نظام میں تبدیل ہو گیا۔

جب زار اور کلیسا کے چنگل سے رہائی ملی، تو انتقام اور نفرت کے جذبوں کا ہدف نہ رہا، استحصال ختم ہوا، خوشحالی اور ترقی کی جھلک دکھائی دی، تو تن آسانی در آئی، جب سب کچھ ملنے کی ضمانت ہو تو فالتو محنت کون کرے، کیوں کرے، کھیتوں کی فصلیں، کارخانوں کا مال کم ہوتا گیا ـــــ حتّٰی کہ برزنیف کو کہنا پڑا کہ ہمیں سمجھ نہیں آتی نوجوان نسل کو کیا کہہ کر کام پر آمادہ کر سکیں ـــــ وہی بات جس کا سرمایہ دارانہ نظام کے حامل انہیں طعنہ دیتے ہیں کہ جذبہ محرکہ ان کے پاس نہیں، سرمایہ دارانہ نظام میں تو نفع کا ایک ایسا جذبۂ محرکہ ہے جو آسائشوں کو سمیٹنے، دولت کو جمع کر کے اپنے لئے، اپنی اولاد کے لئے عیش کوشیوں کا اہتمام کرنا ہوتا ہے مگر جہاں یہ جذبہ نہ ہو ـــــ وہاں برزنیف کی الجھن تو سمجھ میں آسکتی ہے، اس کا حل سمجھ میں نہیں آسکتا، آئے بھی کیسے، اس کا حل اکیلی عقلِ انسانی کے بس کی بات ہی نہیں، عقل تو بس، سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر، اس کا حل تو عقلِ کُل کے پاس ہی ہے یا اس عقل کے بس میں جو وحی کی روشنی میں راستہ ڈھونڈتی ہو۔

وحی کی رہنمائی ہی وہ ذہن پیدا کر سکتی ہے جس کے لئے جذبۂ محرکہ نفع اور زراندوزی نہیں ہوتا، وہ جس پیغام پہ ایمان لا چکا ہوتا ہے وہ دولت کو سمیٹنے کا نہیں، خدا کی راہ میں، انسانیت کی بھلائی کے لئے خرچ کرنے کی راہ دکھاتا ہے

سرمایہ داری نظام کے حامل ہی نہیں روسی کمیونزم کے وابستگان بھی برزنیف سے یہی سوال کرتے ہوں گے کہ آخر کوئی ایسا کیوں کرے کہ اپنی خون پسینے کی کمائی اپنی ہنرمندی کے بل پہ کمائی دولت دوسروں کے لئے کھلی کیوں رکھے کیوں دوسروں کو، ضرورت مند ہی سہی، کیوں دے دے ـــــ قارون کا کہنا بھی یہی تھا کہ میری دولت میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے، اس پر میرا اور صرف میرا حق ہے، ٹاٹا اور برلا، فورڈ اور فیلڈ، سوزوکی، نسان، ہٹاچی کے مالکان کا آج بھی یہی کہنا ہے۔

وہ مجبوری ہیں ـــــ ان کے نزدیک زندگی کا تصور ہی اس دنیا کی زندگی تک ہے، موت جس کا انجام اور اختتام ہوتا ہے، حیات بعد الموت کا تصور اگر کہیں ہے بھی تو محض تصوراتی سا جس کا اس کی زندگی، ان کی سوچ پہ کوئی IMPACT نہیں ہوتا ـــــ اور وہاں بھی کسی نہ کسی عقیدے، کسی نہ کسی شخصیت کے سہارے انہیں جنت کی نوید ملتی رہتی ہے ـــــ مکافاتِ عمل کا تصور جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب، قرآنِ مجید میں ملتا ہے اور کہیں نہیں، ـــــ اور زندگی اس کی رُو سے اک جوئے رواں ہے موت اس کا اختتام نہیں، بس اک موڑ ہے، ندیا بل کھاتی ہے تو نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اس کی روانی تو ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کتابِ عظیم پہ ایمان لانے والوں کا یہ ایمان ہے کہ زندگی موت سے ختم نہیں ہوتی، اگلی منزل میں داخل ہو جاتی ہے اور وہاں مدارج اس بات پر منحصر ہیں کہ یہاں اس دنیا میں ہمارے اعمال کس قسم کے تھے ـــــ مکافاتِ عمل کے دن وہی کچھ ملے گا جو تم اپنے ہاتھوں آگے بھیج چکے ہو، ـــــ اس دنیا میں انسان کا جسم ان چیزوں سے نشوونما پاتا ہے جو وہ اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ یہ جسم یہاں رہ جاتا ہے ـــــ مگر انسان محض اس جسم کا نام نہیں، جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے، وہ انسان کی ذات یا خودی ہے، یہ ذات ہر شخص کی اپنی، منفرد اور ناقابلِ تقسیم ہوتی ہے، اس کا ہر عمل اپنے نقوش اس پر مرتسم کرتا رہتا ہے، اس کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ دوسروں کو دیتا ہے، اس کے کام وہی آتا ہے جو وہ فلاح کے کاموں میں خرچ کرتا ہے جس سے اس معاشرے کا حسن سنورتا ہے جس میں وہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے، وہ اعمال جس سے اونچ نیچ مٹتی ہے، مساوات قائم ہوتی ہے ـــــ یہ اس کی ذات کو مستحکم کرتے ہیں، سنوارتے ہیں۔

اگر اس دنیا میں وہ اپنی ذات کی نشوونما کا اہتمام نہیں کرتا، تو وہ ارتقاء کی اگلی منزل کے قابل نہیں ہو پاتا، اس کی پرواگریس رُک جاتی ہے ـــــ اور ارتقاء کے رُک جانے کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے جو جہنم ہی کا دوسرا نام ہے، اگر جہنم سے بچنا ہے تو اس زندگی میں وہ صلاحیتیں بخش کام کرنے ہوں گے جو انسانیت کی نشوونما میں ممد و معاون ہوں، کوئی تاریخی وجوب کسی معاشرے کی تبدیلی کا موجب نہیں بنتا، معاشرے پر مشتمل انسانوں کے اعمال، جن اقدار پہ ان کا معاشرہ قائم ہے وہی کسی معاشرے کے قیام و ثبات یا اس کے تحلیل ہونے اور عدم وجود کی وجہ بنتے ہیں، قائم وہی معاشرہ رہتا ہے جو انسانیت کی بہتری کی سمت کوشاں ہو، واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

علامہ اقبالؒ نے اشتراکیت کے فلسفے میں مضمر کمزوری کو دیکھ کر اس کا مآل بھانپ لیا تھا۔

اور اس حُسنِ اتفاق کو کیا کہیئے کہ جس خطۂ زمین کو ایک مثالی اسلامی مملکت بنانے کا خواب انہوں نے دیکھا، اسے روس کی مسلم ریاستوں کے ہمسائے میں واقع ہونا تھا، قدرت یہی چاہتی تھی کہ جب روس کا نظام پراگندہ ہو، تو اس کے ہمسائے میں ایک ایسا مثالی معاشرہ تشکیل پا چکا ہو جو چاہیئے اس سے چھوٹا ہو مگر عدل و احسان کا نمونہ ہو علم و فضل میں، سائنس و فن میں کسی سے کمتر نہ ہو ___ کم تر کیا ایک درجہ برتر ہی ہو، مومنوں کا مقام خود اللہ تعالیٰ نے انتم الاعلون بنایا ہے۔

مومن بالائے ہر بالا ترے بر نہ تابد غیرت او ہمسرے

جنگِ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد دنیا کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ کوئی بھی قوت اس مقام پر نہیں تھی کہ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کر سکے، اس دور میں کوئی بھی قوم اپنے قدرتی ماحول کے مطابق اپنے لئے فیصلے کر سکنے کی پوزیشن میں تھی، برطانیہ جنگ کے بعد مقبوضہ علاقوں کو بزور زیرِ نگیں رکھنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ امریکہ دور الگ تھلگ تھا اور ابھی سامراجی قوت کے طور پر نہ اُبھرا تھا، روس کا اپنی جگہ بُرا حال تھا، ہم چاہتے تو اپنے عقائد کے مطابق، اپنے قائدین اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا ایک خطۂ زمین وجود میں لا سکتے تھے مگر ہم نے تو اقبال کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ کون سے عربی ملوکیت کے اثرات کو اسلام کے چہرے سے کھُرچ کر اسے کس تابناک اور روشن ___ اصلی اور منزہ حالت میں نافذ کرنا چاہتے تھے اور جناح کے نزدیک اسلامی حکومت کا طرۂ امتیاز کیا تھا ___ اربابِ اختیار سیاست گری کے ساتھ سب اونچے طبقے جنگ زرگری میں مشغول ہو گئے، وہ اس کے وسائل پر یوں جھپٹے جیسے مالِ غنیمت سامنے ہو ___ اور چالیس پینتالیس سال کا یہ عرصہ ___ گویا ہاتھ سے گنوا دیا، جس قافلے کو ایک نبار کلیم بے تجلّیٔ فراعینؔ ہامانوں اور قارونوں کے چنگل سے چھڑا لایا تھا، وہ نئی سرزمین میں آ کر اسے ہی منزلِ مقصود سمجھ بیٹھے ___ حالانکہ اسے اس سرزمین میں اس لئے لا کر بسایا گیا تھا کہ وہ اپنی تربیت کر سکے کیونکہ اسے آگے بڑھنا تھا، انسانیت کے لئے ایک نئی مثال بن کر سامنے آنا تھا، دانائے راز نے بہت پہلے اسے سمجھا دیا تھا کہ

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے مکان و زماں اور بھی ہیں

جنگِ عظیم دوم کے چالیس سال بعد جب روس کا نظام اپنی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے مضمحل ہو کر انجام کو پہنچا، اگر انہی دو نسلوں کی زندگیوں پر مشتمل سالوں پہلے یہ خطۂ زمین ان خطوط پر نشو و نما پا چکا ہوتا، دنیا کے پاس ایک جنت بداماں معاشرے کا ماڈل ایک مینارِ نور کی صورت جگمگا رہا ہوتا ___ تو روسی استبدادی نظام سے DISILLUSIONED لوگوں کو کہیں بھٹکنا نہ پڑتا ___ روسی نظام (میں اسے اشتراکیت نہیں کہتا، نہ یہ اشتراکیت تھی) سے مایوس

ہوکر سرمایہ داری نظام میں پناہ لینا، تو آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا، سے بھی قابلِ رحم حالت ہے۔ صورتِ حال کی بہتر تشریح انگریزی محاورے، FROM FRYING PAN INTO THE FIRE میں ہے۔

افسوس کہ ہم اقبال اور قائد کے خوابوں میں حقیقت کا رنگ نہ بھر سکے، ہمارا اپنا، اس خطۂ زمین پہ بسنے والوں کا تو جو نقصان ہوا، موجودہ حال میں ہم انسانیت کے مجرم بھی ٹھہرے۔

اس وقت وہ صورت حال تو نہیں کہ کوئی چھوٹی قوم آزادانہ اپنی راہ پر گامزن ہو سکے جیسا قیامِ پاکستان کے وقت تاریخی طور پر ممکن تھا۔ پھر بھی تلافیٔ مافات کے لئے کچھ نہ کچھ تو کیا جا سکتا ہے۔

سب سے بنیادی بات تو قائدِ اعظم کے تین رہنما اصولوں میں سب سے پہلا اصول اتحاد ہے، (دوسرا ایمان، تیسرا تنظیم) کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ملک میں انتشار کو دُور کرنے کے لئے، سب لوگ، سیاسی اور مذہبی رہنما، خواص اور عام سبھی عہد کریں کہ سب ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر یک جہتی کی فضا پیدا کریں گے، سمجھ لیں کہ ہمارا مستقبل مشترک ہے، ڈوبے تو سبھی ڈوبیں گے، پار لگے تو اکٹھے لگیں گے، وحدت سے الگ کسی کا کوئی مستقبل نہیں، خدا کی کتاب پہ سچ مچ ایمان لائیں اور سمجھ لیں کہ یہی ہمارا منشور ہے، اس سے رہنمائی حاصل کریں، اس پہ عمل کریں، تو خدا کا ہر وعدہ سچا ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ کافر کبھی مومنین پہ غالب نہیں آسکتے۔ ہم اس خطے میں آج بھی متحد ہو کر، منظم ہو کر قرآن میں دیئے گئے اصولوں کے مطابق معاشرہ تشکیل دینے میں جُت جائیں، تو ہم جلد غیروں کی محتاجی سے بچ جائیں گے اور ارد گرد کے دوستوں، ہمسایوں کے ساتھ مل کر خود ایک ایسی طاقت بن سکیں گے کہ سرمایہ داروں کا طاغوتی نظام ہمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا، مگر اس کے لئے اتحاد اور مسلسل عمل شرط ہے، زبانی زبانی اسلام کا نام اور عملاً سرمایہ داری نظام نافذ کر کے ہم نہ تو اس ملک کی حالت بہتر کر سکتے ہیں اور نہ ہی دنیا کے لئے کوئی نئی مثال بن سکتے ہیں جو ہمیں قائدِ اعظم بنانا چاہتے تھے اور جسے وہ ہمارا فریضہ قرار دے چکے ہیں ——

آج تاریخ ایک ایسے موڑ پہ آپہنچی ہے کہ ہر لمحہ قیمتی ہے، ہر فروگزاشت، ہر غفلت صدیوں پیچھے پھینک سکتی ہے، آگے بڑھنا پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کی طرح کٹھن ہے مگر منزل مقرر کر لی جائے، تو ہر اٹھنے والا قدم مسافت کو کم اور راہ کو آسان کرتا ہے۔

ہر مثبت سوچ رکھنے والے پر اس وقت یہ فرض ہے کہ وہ اربابِ اختیار پر وقت کی نزاکت اور عمل کی اہمیت اجاگر کرتا جائے ورنہ وہ بھی تاریخ کی نظر میں مجرم ٹھہرے گا۔

حقائق و عبر

خلافت

تنظیم اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک بار پھر وضاحت فرمائی ہے کہ "خلیفہ" سے مراد "خلیفتہ اللہ" ہے۔ نیز یہ کہ بجز امام ابن تیمہ جمہور علماء کا موقف بھی یہی ہے۔

(ہفت روزہ 'ندا'۔ بابت ۳۱/۱۶ دسمبر ص ۱۹)

حالانکہ بقول علامہ الماوردیؒ امتِ مسلمہ کے تمام علماء اور فقہاء کا اس امر پر اتفاقِ کامل ہے کہ جو کوئی بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ سمجھے، وہ فاسق و فاجر ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جب کسی دیہاتی نے یا خلیفتہ اللہ کہہ کر پکارا، تو آپ نے اس کی فوراً اصلاح کی اور فرمایا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں، رسول اللہ صلعم کا خلیفہ ہوں ——— (احکام السلطانیہ ص ۱۵)۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتوے میں بوضاحت فرمایا ہے کہ "خلیفتہ اللہ" کا عقیدہ شیخ اکبر محی الدین کے ذہن کی پیداوار ہے جو وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ (الفتاوی الکبری جلد دوم ص ۵۵۳)۔ ڈاکٹر صاحب کے جمہور علماء کی فہرست میں نہ جانے کون لوگ شامل ہیں۔

تجاہل عارفانہ

ماہنامہ الفجر کراچی بابت دسمبر ۹۱ء لکھتا ہے۔

"پیٹرول سے پہلے ۱۹۳۲ء میں جزیرۃ العرب میں صرف پچاس غیر ملکی کافر رہتے تھے۔ ۱۹۷۱ء تک یہ تعداد ۲۴۲، ۹۹، ۲ ہوگئی..... گذشتہ سال سعودی اقتدار کو بچانے کے لئے پانچ چھ لاکھ کافر فوج کو کرایہ پر بلوایا گیا۔ جس کے نتیجہ میں پانچ لاکھ کے قریب مظلوم مسلمان ہلاک ہوگئے ——— جریدہ لکھتا ہے کہ یہ وہ مقدس سرزمین ہے جس

کے متعلق سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ

"جزیرۃ العرب سے کفار، یہود و نصاریٰ کو نکال باہر کرو۔" (بخاری)

نظر آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم نہ سعودی حکمرانوں کے سامنے ہے نہ ہمارے اہل حدیث علماء کے نزدیک واجب العمل۔

حضرت قائدِ اعظمؒ اور مولانا مودودی مرحوم

ہفت روزہ ایشیا نے اپنی ۲۹ دسمبر ۹۱ء کی خصوصی اشاعت میں ایک بار پھر یہ تأثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ قائدِ اعظمؒ، مولانا مودودی کی نظر میں پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے۔

طلوعِ اسلام۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن اگر مولانا مودودی بھی ایسا ہی سمجھتے تھے تو انہوں نے جماعت کے اراکین کو پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے سے منع کیوں کر دیا تھا؟

نیا قدم

اوسلو (ناروے) سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق بزمِ اوسلو کی زیرِ نگرانی قرآنی گھرانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں نے نہ صرف اپنے لئے "بزمِ نونہال" قائم کی بلکہ یکم دسمبر ۱۹۹۱ء کی صبح اس ننھی بزم کے پلیٹ فارم سے بچوں کے لئے تین گھنٹے کا ایک سیمینار بھی منعقد کر ڈالا جس میں اوسلو میں موجود بچوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دوسری تقاریب کے علاوہ اسلامی معاشرت سے مرتب کردہ پچاس سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ حل کر کے ان بچوں نے نہ صرف اپنی ذہانت کا لوہا منوایا بلکہ انعامات بھی حاصل کئے۔ اوسلو کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے جس کی کامیابی کا سہرا اوسلو میں مقیم، طاہرہ بیٹی نرگس کے سر بتایا گیا ہے۔

ادارہ بزمِ نونہال کی سرپرست اور کارکنانِ بزم کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہے کہ دیارِ غیر میں مقیم دوسری بزمیں بھی اس راہ پر گامزن ہو کر بچوں کی رہنمائی کا اہتمام کریں گی۔ (ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام)

بشیر احمد عابد۔ کراچی

اُٹھ کہ پھر سے خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں

تحریکِ طلوعِ اسلام ــ جس کا مختصر تعارف یہ کہ آج سے کوئی نصف صدی قبل اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا، راستہ صراطِ مستقیم، زادِ سفر، تقوٰے اور منزل، جنتِ ارضی کا قیام۔

تحریکوں کے سفر انتہائی دشوار اور صبر آزما ہوتے ہیں۔ تحریکیں قافلے کی شکل میں سفر کرتی ہیں اور قافلہ امیرِ کارواں کے بغیر سفر نہیں کرسکتا۔ اچھا راہنما مل جائے، تو سفر کی مشکلات اور صعوبتیں کم ہوجاتی ہیں اور قافلہ درست سمت میں جانبِ منزل گامزن رہتا ہے۔ بصورت دیگر ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

قافلہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا شکار ہوکر تتر بتر ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف امیرِ کارواں کی اپنی دشواریاں ہوتی ہیں۔ اسے ہر شریکِ سفر کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ خواہ کوئی سُست ہو یا سبک، بیمار ہو یا صحت مند، کم عقل ہو یا دانشمند امیرِ کارواں کو سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام ان تمام تر دشواریوں کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں ہے۔ منزل کے حصول کے لئے اب تک جو اقدام کئے ہیں ان کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں کامیاب، ناکام اور اختلافی سبھی کچھ شامل ہے لیکن اس کی کامیابی کا ایک پہلو اس قدر نمایاں اور منفرد ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ ہے اس کا ارتقاء ــ یعنی اپنی منزل کی جانب مسلسل اور بتدریج پیش قدمی! شروع سے لے کر آج تک اس کا کوئی قدم نہ رکا اور نہ پیچھے ہٹا۔ سُست سہی مختصر سہی، مگر یہ قدم آگے ہی بڑھا اور اسے منزل سے قریب سے قریب تر کرتا گیا۔ بعض احباب اس کی سُست روی کو جمود پر محمول کرتے ہیں ؎

شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق　　افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

انہیں تحریک میں چونکہ حرکت کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا، لہٰذا وہ اسے ایک ناکام تحریک سمجھ لیتے ہیں حالانکہ یہ درست نہیں۔ رفتار کی نسبت سے ایک خوبصورت مثال یاد آئی۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی ہو یا اس پر کہیں کام ہو رہا ہو، تو اس جگہ سے بہت پہلے ایک بورڈ نصب کر دیا جاتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے "ڈی ٹور" (DETOUR)۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اب آپ شاہراہ چھوڑ کر کچے پہ اُتر آئیں۔ اس تبدیلی سے گاڑی کی سپیڈ اگرچہ کافی کم ہو جاتی ہے لیکن سفر بدستور جاری رہتا ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا قافلہ جس شاہراہ پر سفر پذیر ہے۔ اس کا ٹھیکیدار مذہبی پیشوائیت ہے جس نے ہر صاحبِ فکر و نظر کو ڈی ٹور کر رکھا ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ ہمارا قافلہ رُک گیا ہے حالانکہ یہ رُکا نہیں۔ سفر جاری ہے، رفتار سُست ہو سکتی ہے۔ سفر اگر صحیح منزل کی طرف جاری رہے، تو سُست روی کے باوجود اسے ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ بابا جیؒ اس ضمن میں گھڑی کی مثال دیا کرتے تھے جس پر سوئیاں تو تین نظر آتی ہیں لیکن تاریکیٔ شب کو نورِ سحر سے ہمکنار ہونے تک چھوٹی سوئی جہاں ہزاروں چکر کاٹتی ہے، بڑی ایک ہی چکر میں یہ سفر طے کر لیتی ہے۔

بعض تحریکیں اپنے مقاصد کے حصول کے اعتبار سے انتہائی سبک رفتار اور کامیاب کہلاتی ہیں، سطحِ بین لوگ ان کی کامیابی کو عزم راسخ، انمٹ، لگن اور بے پناہ خلوص و ایثار سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ایسا اعتبار فی الحقیقت غلط نگہی اور خود فریبی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ان تحریکوں کی کامیابی کی اصل وجہ ان کے مقاصد و مسالک کی نوعیت ہوتی ہے۔ خود غرضی، مفاد پرستی، دھوکا دہی اور لالچ ان کے زعماء اور زمیلوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ ایسے مقاصد کے حصول کے لئے یہ ہر راستہ اور ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو راستہ بھی انہیں جتنی جلدی منزل تک پہنچا دے — وہی صراطِ مستقیم ہے۔ ان کا تقویٰ، اصول و قوانین کی پابندی نہیں بلکہ دولت و درجے کا بے محابہ استعمال ہوتا ہے اور یہ ان حربوں کو ایسے دلکش اور دلفریب انداز سے استعمال کرتے ہیں کہ اگر مُردے دیکھ لیں، تو وہ بھی حرکت میں آجائیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مفت کی شراب قاضی بھی پی لیتا ہے۔ حالانکہ جو شراب یہ حضرات پیش کرتے ہیں، اسے قاضی تو کیا ملائکہ بھی پی جائیں۔

قرآن کریم ایسی کامیابی کی شدت سے نفی کرتا ہے، کہا وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا — جو کوئی ہمارے قوانین کے علی الرغم چلتا ہے، اسے کامیابی تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس کی نوعیت بڑی عارضی ہوتی ہے۔ ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ — ہم اسے بہت جلد نذرِ آتش کر دیتے ہیں اور یہ نہایت ہی دردناک انجام ہے (۲/۱۲۶)۔ مومنین سے کہا، تم ایسی کامیابی کی نہ تو تمنا اور نہ ہی کوشش کرنا۔ فرمایا۔ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ — قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی چہل پہل، بستیوں میں ان کی گہما گہمی تمہاری نگاہ کو فریب نہ دے دے اور تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ اس قانون کے خلاف چلنے سے بھی زندگی کی خوشگواریاں مل سکتی ہیں۔ ان کی کامیابی پر نہیں بلکہ انجام پر نظر رکھو۔ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۔ ان کا آخری سٹاپ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے (۳/۱۹۶-۱۹۷)

تحریکِ طلوعِ اسلام زندگی کی انتہائی بلند اقدار کی پاسدار ہے اور ان اقدار کی پاسداری کوئی آسان کام نہیں۔ حکیم الامت نے کہا تھا ؎

چو می گویم مسلمانم، بلرزوم
کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را!

اس تحریک کو مقصد و مسلک کی رو سے جو دشواریاں درپیش ہیں ان سے کہیں بڑھ کر تنظیمی مشکلات کا سامنا ہے۔ عام تحریک کی کامیابی کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں "رائے" رکاوٹ نہیں بنتی۔ ایسی تحریکیں اصول پرستی کی بجائے شخصیت پرستی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لہٰذا، لیڈر کو نہ فیصلہ کرنے میں دقت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے فیصلوں پر کوئی قدغن یا "آپ نے بجا فرمایا" اس سے زیادہ بحث کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ ایسے لیڈر کو نہ تو اپنے ساتھیوں کے اعتراضات کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے دکھ درد کا احساس ۔ اس کے برعکس، قرآنی تحریک کا رہنما ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسے ہر فیصلہ مشاورت سے طے اور ہر ایک کی رائے کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ یہ انتہائی مشکل کام ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ سنگین رکاوٹ بن جاتا ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کی کامیابی کا اندازہ کرنا ہو تو ان جملہ دشواریوں اور رکاوٹوں کو مدِنظر رکھیئے، آپ بھی پکار اٹھیں گے ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو اپنے منفرد بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کیا یہ گمان کئے بیٹھے ہو کہ جنت میں یونہی سستے داخل ہو جاؤ گے۔ یہ ملّا یا سرمایہ دار کی جنت نہیں جو چند رکعتوں یا چند سکّوں کے عوض حاصل ہو جائے۔ یہ مجاہدوں اور صابرین کی جنت ہے۔ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ اور یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ تم میں سے کون سر توڑ جدّوجہد کرتا اور مشکلات و مصائب کے سامنے سینہ سپر ہوتا ہے (۳/۱۴۱)۔ یہ درست ہے کہ کامیابی کا معیار تکمیلِ مقاصد ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غلط طریقوں سے حاصل کردہ کامیابی پر بگل بجانا خود فریبی کہلاتا ہے۔ تاریخ ایسی کئی کامیابیوں کا نوحہ لکھ چکی ہے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام اپنے مقصد و مسلک کے عین مطابق ہر آن ایک نئی شان کے ساتھ خراماں خراماں روبہ سفر ہے۔ اس کا مسلک بغیر ہنگامی آرائی کے فکرِ قرآنی کو عام کرنا ہے۔ اگر ہم بھی دیگر تحریکوں کی طرح اچھوتے حربے استعمال کرتے، تو آج ہماری تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں شمار ہوتی۔ شکاری جب شکار کھیلتا ہے، تو دانہ ڈالنے کے ساتھ پھندہ بھی لگا دیتا ہے۔ اس کھیل میں دانہ محض بہانہ ہوتا ہے۔ اصل مقصد شکار کو پھانسنا ہوتا ہے۔ ہم عصر تحریکوں کے سرسری جائزہ سے

یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہر شکاری نے طرح طرح کے پھندے لگائے ہوئے ہیں۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم پھندہ نہیں لگاتے صرف دانہ ہی ڈالتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی مرضی سے چگتے ہیں۔ بعض چگ کر اڑ جاتے ہیں اور بعض ہمارے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں۔ حقیقتاً ان میں سے اکثریت کو حضرت مُلّا نے اس قدر ہراساں اور خوفزدہ کر رکھا ہے کہ وہ ہماری چوگ چگتے ہی نہیں۔ اگر ہم اس پس منظر میں اپنی کامیابی کا جائزہ لیں، تو گذشتہ سالوں کا ماحصل نہ صرف باعثِ فخر ہے بلکہ نہایت امید افزا اور انتہائی حوصلہ بخش ہے۔ اس عرصہ کے دوران شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے لوگ پکے ہوئے پھل کی طرح دامنِ قرآن میں گرے۔ اہلِ حدیث، اہلِ فقہ، اہلِ تشیع، جرنیل، کرنیل، سپاہی، جج، وکلاء، صحافی، ادیب، جید سائنٹسٹ، ڈاکٹر، انجنیئر، آجر، مزدور، غرضیکہ ہر مکتبۂ فکر اور ہر شعبۂ زندگی سے لوگ ہمارے رفیقِ سفر بنے اور پھر لوٹ کر واپس نہیں گئے۔ آج حالت یہ ہے کہ نہ صرف وطنِ عزیز میں بلکہ سمندر پار بھی ہر جگہ شمع قرآنی کے پروانے موجود ہیں۔ فالحمد للہ علی ذلک!

میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے بعض احباب انتہائی مایوسی اور گھبراہٹ کا شکار ہیں، وہ تحریک کے مستقبل کے لئے نہایت پریشان اور فکرمند ہیں۔ انھیں چاروں سو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ تحریک کے کسی اجلاس میں اگر چالیس میں سے چار ممبر بھی غیر حاضر ہوں، تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سب نے بائیکاٹ کر رکھا ہو۔ یہ انتہائی منفی اندازِ فکر ہے اور قرآن کریم کے طالب علم کو قطعی زیب نہیں دیتا۔ قرآن کریم تو نزع کے عالم میں بھی زندگی کی امید دلاتا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا۔ حالات خواہ کچھ بھی ہوں تمہیں مایوس اور افسردہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۔ کامیابی تمہارا مقدر ہے بشرطیکہ قوانین خداوندی کی صداقت پر تمہیں پورا پورا یقین ہو (۳/۱۳۸)۔ مومنانہ روش کا تقاضا ہے کہ ہمیں ہمیشہ مثبت اور اعلیٰ اندازِ فکر اختیار کرنی چاہیئے۔ یہ ایک مسلسل اور بتدریج عمل ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم کی تعلیمات کو دل کی گہرائیوں میں اتارنا پڑتا ہے۔ اس وقت ہماری مثال ایک شکستہ گاڑی کی ہے جس کی باڈی پر سینکڑوں ڈینٹ پڑ چکے ہوں۔ اس گاڑی کو بغیر ڈینٹ نکلوائے پینٹ کروا دیا جائے، تو وہ ٹھیک نہیں ہو جائے گی۔ ہمارا نفس بھی جھوٹ، فریب، حسد، نفرت اور بغض سے داغ داغ ہے۔ ہم اگر یہ داغ دھبے مٹائے بغیر قرآنی رنگ میں رنگ جانے کی کوشش کریں گے، تو وہ کامیاب نہیں ہوگی۔ جھوٹ بولنا ترک کر دیجئے۔ صاف سیدھی اور دوٹوک بات کرنے کی عادت ڈالئے۔ آپ کو اعتمادِ نفس حاصل ہوگا۔ وعدہ خلافی سے احتراز کیجئے آپ کو دوسروں کا اعتماد حاصل ہوگا۔ غصہ فرو کرنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچئے کبھی ندامت اور شرمندگی نہیں ہوگی۔ لوگوں کی خطاؤں اور زیادتیوں کو معاف اور برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیجئے، آپ پُروقار اور پُربہار شخصیت کے مالک بن جائیں گے۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر کبھی اصرار نہ کیجئے، انہیں تسلیم کر لیا کریں۔ آپ کی مسلسل اصلاح ہوتی رہے گی۔ اختلاف و اعتراض کی صورت

میں مثبت اور تعمیری انداز اختیار کیجئے، بغض، حسد، نفرت سے نجات مل جائے گی۔ حسبِ استطاعت جیب کھلا رکھئے کبھی تنگدستی کا سامنا نہیں ہوگا۔ یہ سب خوبیاں صفاتِ خداوندی کا حصہ ہیں۔ اپنے آپ کو حدِ بشریت ان اوصاف سے متصف کرتے جائیے ایک وقت آئے گا کہ آپ کے لئے ہر مقام جنت مقام ہوگا۔ یہ مولویانہ نصیحت نہیں بلکہ آزمودہ نسخہ ہے۔ آپ اپنے آپ کو جس حد تک قرآنِ کریم سے ہم آہنگ کریں گے خوف و حزن سے اتنے ہی مامون ہو جائیں گے۔ قرآنِ کریم کے مطابق جہنمی زندگی کی سب سے نمایاں علامت خوف و حزن ہے۔ اس لئے کامل نجات کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

نفسِ مطمئنہ سے کہا جائے گا "تیرا طریقِ زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا" اس لئے تیری زندگی تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے خوشگواریوں اور آسائشوں کا مسکن ہوگی۔ لیکن یاد رکھنا، یہ چیز انفرادی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی، اجتماعی زندگی سے ہو سکتی ہے۔

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۔ لہٰذا اگر جنت کا طلبگار ہے، تو پھر جماعت میں شامل ہو جا۔ (۳۰-۲۹/۸۹)

ہمارے بعض رفقاء جماعت کی اس اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور جنتِ ارضی کے قیام کے لئے تنہا سرگرداں رہتے ہیں۔ گو کہ انفرادی سطح پر ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر روشنی کا مینار ہوتا ہے۔ گفتگو میں دوٹوک، لین دین میں کھرا، صدقہ و خیرات میں پیش پیش اور بحث و مباحث میں تو ان کے دلائل مارٹر گولے کا اثر رکھتے ہیں۔ فریقِ مخالف ایک آدھ فائر میں ہی چت ہو جاتا ہے۔ لیکن جب معاملہ اجتماعی تعاون کا درپیش ہو تو ان کی سوچ ان گوالوں سے ملتی جلتی ہے جنہوں نے شہنشاہِ بابر کے تالاب کو اس لئے خالی چھوڑ دیا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا بھر دے گا۔ طلوعِ اسلام کی تحریک جس عارضی تعطل کا شکار ہے وہ ایسی ہی سوچ کا نتیجہ ہے۔ میرے ایک محترم بزرگ اکثر کہا کرتے ہیں، ہمیں کیا ضرورت بلاوجہ پریشان ہوں۔ آخر کار ساری کائنات میں اسی نظام کو تو قائم ہونا ہے۔ ہم اگر نہ کر سکے تو کیا، خدا خود جو کر رہا ہے! تحریکِ طلوعِ اسلام کی اکثریت باصلاحیت افراد پر مشتمل ہے لیکن سب کا حال ایسا ہی ہے۔ دراصل اس طرح کی لاپرواہی اور غفلت ہماری قومی نفسیات کا حصہ ہے۔ ہماری شخصیت کا یہ ایک بہت بڑا نقص ہے۔ بہت کم ایسے خوش بخت ہیں جنہوں نے اس پر قابو پایا ہو۔ جب تک ہم اس اندازِ فکر کو ترک نہیں کریں گے، منزل قریب نہیں آسکتی!

قرآنی نظام، قرآنی نظام کی رٹ لگا لگا کر ہمارے حلق خشک ہو جاتے ہیں لیکن کسی کو احساس نہیں کہ جب تک ہم سب مل جل کر قدم نہیں اٹھائیں گے، یہ نظام قائم نہیں ہوگا۔ نظام قائم ہو جائے تو اسے قائم رکھنے کے لئے انتھک

جدّوجہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے جرنیل اپنی دھن میں مگن اور ہمارے جج اپنی ذات میں سرمست! کسی کو پرواہ نہیں کہ اس تحریک کو ان کی صلاحیتوں کی کتنی اشد ضرورت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآنی معاشرے میں نہ کوئی ننگا ہوگا اور نہ بھوکا! نہ محروم و سائل! ہر فرد کی ضرورت ٹھیک ٹھیک پیمانوں سے پوری کی جائے گی۔ اور یہ سب کچھ کہہ کر ہم معاشرے کے قیام کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے مطابق اس سے بڑھ کر فکر و عمل کی ناہمواری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ؕ

خدا کے نزدیک یہ بات انتہائی مذموم اور قابلِ گرفت ہے کہ ایسی باتیں کی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے (۶۱/۳) لہٰذا وہ سختی سے منع کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ؕ

اے جماعتِ مومنین! ایسے دعوے کیوں کرتے ہو جن پر تم عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ (۶۱/۲)

عمل کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارا حال بھی عامۃ الناس جیسا ہے۔ یہاں عام شہری سے لے کر سربراہِ مملکت تک ایک ہی رٹ لگاتا ہے کہ "فلاں کام ہونا چاہیئے" برائی ختم ہونی چاہیئے، جرائم ختم ہونے چاہئیں، رشوت ختم ہونی چاہیئے۔ لیکن نہ خود کرتا ہے اور نہ ہی کر کے دکھاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی ایسی ہی ذہنیت کو سامنے رکھ کر قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ اے رسولؐ! یہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کتنا خرچ کرنا چاہیئے لگتا ہے کہ جب تک ہم انہیں کچھ بتائیں گے نہیں یہ یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ کر! ان سے کہو کہ یہ تو ہم بعد میں بتائیں گے کہ تمہیں کتنا خرچ کرنا چاہیئے۔ پہلے کام کی بات سن لو۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ

ان سے کہو کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرنا چاہتے ہو شروع کر دو۔ خیر میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کی ابتدا والدین سے کرو۔ پھر اقربا اور پھر معاشرے کے دیگر ضرورتمند! (۲/۲۱۵)

ذمہ داری کا احساس دلانے کے لئے اس سے بہتر نصیحت کیا ہو سکتی ہے؟ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں والدین کی ضروریات اس وقت پوری کروں گا جب قرآنی نظام قائم ہو جائے گا۔ نظام قائم ہو یا نہ ہو، ہم بہرحال والدین کی خدمت گذاری کرتے رہتے ہیں۔ جب ہم یہ کچھ کر سکتے ہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم معاشرے کے دیگر ضرورت مندوں کو نظام کے قیام تک ٹال دیں۔

یاد رکھیئے! اگر ہم قرآنی نظام قائم کرنے کے دعویدار ہیں، تو پھر ہمیں تیار ہونا پڑے گا۔ ضرورتمندوں کی ضروریات پوری

کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی پڑے گی۔ اگر یہ عادت اور صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہو سکتی، تو پھر اس کی امید نظام کے قائم ہونے پر بھی نہیں رکھی جا سکتی۔ جس طرح آج ہم کسی نہ کسی بہانے "مبرا عن صدقات" ہو جاتے ہیں۔ نظام کے قیام پر کوئی اور بہانہ تراش لیں گے، خوئے بدرا، بہانہ بسیار! قرآنِ کریم کے نزدیک کام کا صرف ایک بہانہ ہوتا ہے ــ کام کر دکھانا! دن ہو یا رات، کھلے بندوں یا خاموشی سے، تنگی ہو یا آسودگی، زندگی کی ہر حالت میں زمان و مکان کی قید سے آزاد، اپنا کام کر دکھاتے ہیں۔ نیوٹن، مارکونی، ایڈیسن اس انتظار میں بیٹھ جاتے کہ جب تک لوگوں کا اندازِ فکر سائنسی نہیں ہو جاتا ہم کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے، تو آج انسان چاند کی بجائے افریقہ کی دلدلوں میں دھنسا ہوتا۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں سوچا۔ ان سے جو کچھ ہو سکتا تھا۔ فِی الْبَاسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ۔ کر دکھایا! ہمیں اگر قرآنِ کریم سے عمل کی کوئی رہنمائی نہیں ملتی، تو کم از کم انہی ہستیوں سے سبق سیکھ لینا چاہیئے۔

اُٹھئے اور آگے بڑھئے! اس وقت لاکھوں انسان آپ کی فکری مباحث سے زیادہ آپ کے عملی تعاون کے محتاج ہیں۔ ان کی مسیحائی کیجئے! یہ صحیح ہے کہ ہماری فکر کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ فلک ناز سرمایہ دار، کوہ آسا جاگیردار، سحر آفرین مُلّا لیکن یہ بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے عمل کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ تن ڈھانپنا، روٹی کھلانا، دوائی پلانا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ صلوٰت، معجزات اور جنّات کی حقیقت سمجھانا۔ روٹی کی سمجھ ایک پاگل کو بھی ہوتی ہے لیکن معجزات کو ایک اچھا بھلا دانش ور بھی سمجھنا نہیں چاہتا۔ مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے تو لوگ پتھروں کے آگے سر ٹیک دیتے ہیں۔ انسانوں میں یہ صفات پیدا ہو جائیں، تو لوگ انہیں ولی سمجھ کر سر پر بٹھا لیتے ہیں۔ حاجت براری تو بہت بڑی بات ہے، دل جوئی کے دو میٹھے بول کسی کا دل جیتنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اس وقت ہماری تحریک میں ہر طرح کے ضرورت مند ہیں۔ انہیں کارزارِ حیات میں گوناگوں مشکلات و مسائل کا سامنا ہے۔ کسی کو کاروبار میں، کسی کو روزگار میں، کوئی بیمار ہے اور کوئی نادار! قرآنِ کریم کے مطابق ان کی کمزوری یہ ہے کہ یہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ (لا یسئلون الناس الحافا)۔

سطح بین نگاہیں ان کی مشکلات کا ادراک نہیں کر سکتیں اور انہیں مستغنی سمجھا جاتا ہے۔ (یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف)

لیکن صاحبِ بصیرت ان کی مشکلات کا محققانہ جائزہ لیتے ہیں اور ان کے ہاتھ پھیلانے سے پہلے ان کا یدِ مبسوط ان تک پہنچ جاتا ہے۔ ہماری تحریک میں کئی صاحبِ استطاعت ہیں جو ایسے لوگوں پر نگاہِ کرم کر سکتے ہیں۔ اپنے علم و تجربے سے ان کی راہنمائی کر سکتے ہیں، اپنے رُتبے اور دولت سے مستفیض کر سکتے ہیں۔ ان کی ضروریات محدود اور مختصر ہوتی ہیں۔ آپ کا معمولی ایثار ان کی کایا پلٹ سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحریک طلوعِ اسلام کے اربابِ بست و کشاد کتب فروشی کے ساتھ ساتھ اس پہلو پر بھی توجہ دیں تو قرآنی نظام کے نقوش مزید اُبھر کر

سامنے آجائیں گے۔ قرآنِ کریم کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہوگی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ تمام رفقاء کے ذاتی کوائف اکٹھے کئے جائیں۔ پھر ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو ہر ضرورت مند کی ضرورت کا بغور جائزہ لے کر رپورٹ تیار کرے۔ اس رپورٹ میں ہر ایک چیز کا واضح تعین ہو۔ اس کے بعد صاحبِ استطاعت رفقاء کا تعاون حاصل کر کے ان کا تدارک کیا جائے۔ یہ کام نہ صرف مرکز بلکہ طلوعِ اسلام کی ہر بزم کو کرنا چاہیئے۔ آخر میں سب بہن بھائیوں کو سالِ نو مبارک!

میری دُعا ہے کہ رب العزت ہم سب کو کامیابیوں سے سرفراز فرمائے اور ان کے حصول کے لئے عملِ صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ اس لئے کہ ؎

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
لذتِ تخلیق قانونِ حیات

ناقابلِ فراموش حقیقتیں

حضرت عمرؓ کا مکتوب گرامی حضرت ابوعبیدہ بن جرّاحؓ کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم، عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے امین الامۃ (ابوعبیدہ) کو سلام علیک۔ تم کو معلوم ہو کہ جبلہ بن ایہم غسانی اپنے چچازاد بھائیوں اور خاندانی اکابر کے ساتھ ہمارے پاس آیا تھا۔ میں نے ان کی آؤ بھگت کی۔ سب نے میرے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ان کے اسلام قبول کرنے سے مجھے خوشی ہوئی، کیونکہ ان کے ذریعے اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت عطا کی، مگر پردۂ غیب میں جو چھپا تھا، اس کا حال مجھ کو معلوم نہ تھا۔ ہم حج کے لئے مکہ گئے، جبلہ نے بیت الحرام کے سات طواف کئے، دورانِ طواف میں اس کا ازار ایک فزاری عرب کے پیر تلے آگیا اور ازار کھل کر کندھے سے گر پڑا۔ جبلہ نے بڑھ کر فزاری کو دیکھا اور کہا: تیرا بُرا ہو، تو نے خدا کے حرم میں مجھے ننگا کر دیا۔ فزاری نے کہا۔ خدا کی قسم، میں نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ تاہم جبلہ نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی ناک زخمی ہو گئی اور اس کے اگلے چار دانت ٹوٹ گئے۔ فزاری میرے پاس فریاد لے کر آیا۔ میں نے جبلہ کو بلوایا اور کہا کہ تم نے اپنے فزاری بھائی کے تھپڑ کیوں مارا اور اس کے اگلے چار دانت توڑ دیئے اور اس کی ناک زخمی کر دی؟" جبلہ نے کہا، اس نے پیر کے نیچے میری ازار دے کر کھول دی، خدا کی قسم، اگر بیت اللہ کی حرمت کا مجھے خیال نہ ہوتا، تو اس کو مار ڈالتا۔" میں نے کہا کہ تم نے جرم کا اقبال کیا ہے، اب یا تو وہ تم کو معاف کر دے یا میں تم سے اس کا قصاص لوں گا۔" جبلہ نے کہا۔ مجھ سے قصاص لیا جائیگا حالانکہ میں بادشاہ ہوں اور وہ ایک معمولی عرب ہے!" میں نے کہا۔ تم دونوں مسلمان ہو، میں تمہارے اور اس کے درمیان اسلامی قانون کے بموجب فیصلہ کروں گا۔ جبلہ نے مجھ سے اگلے دن تک مہلت مانگی۔ میں نے مہلت کے لئے فزاری سے پوچھا۔ وہ تیار ہو گیا۔ جب رات ہوئی، تو وہ اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ اونٹوں پر سوار ہو کر شام کی طرف کلب الطاغیہ (رومی قیصر) کے پاس نکل بھاگا۔ مجھے امید ہے کہ خدا نے چاہا، تو وہ تمہارے ہاتھ آئے گا۔

والسلام علیک وعلی جمیع المسلمین۔" (فتوح الشام)

مزید ارشادات

(۱) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ کسی پر کوئی سختی نہ کریں اور نہ لوگوں کا مال غصب کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

تم میں سے جس کے ساتھ حکومت کے آدمی ناجائز سختی سے پیش آئیں، ان کا مقدمہ میرے پاس پیش کیا جائے، میں ان سے باز پرس کروں گا اور اسے اس کی سختی کا مزہ چکھاؤں گا۔

آپ کے اس خطاب کو سُنکر حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا۔

کیا آپ ایسے شخص سے بدلہ اور قصاص لیں گے جو رعایا کو ادب سکھائے۔

آپ نے یہ سُنکر فرمایا۔

ہاں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے، میں یقیناً اس سے بدلہ لوں گا اور کیسے نہ لوں جب کہ میں نے خود آنحضرتؐ کو اپنے آپ سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔

(۲) دوسرا ارشاد۔

اگر کسی حاکم کے ذمے یہ فریضہ ہو کہ وہ کسی اہم شعبہ کے لئے کسی ذمہ دار آدمی کا انتخاب کرے اور وہ اس کے لئے کسی آدمی کو اس بنا پر منتخب کرے کہ اس سے اس کی رشتہ داری یا دوستی تھی، تو اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔

(۳) تیسرا ارشاد۔ حضرت عمرؓ جب عاملوں کو بھیجتے، تو یہ زرّیں ہدایت فرماتے۔

ان لا تركبوا برذونا و لا تاكلو نقيّا و لا تلبسوا رقيقا و لا تُغلّقوا ابوابكم دون حوائج النّاس فان فعلتم شيئًا من ذلك فقد حلت بكم العقوبة۔ (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

عمدہ گھوڑے پر نہ سوار ہونا اور نہ میدہ کھانا، نہ باریک کپڑا استعمال کرنا اور ضرورتمندوں پر اپنا دروازہ بند کرنا۔ اگر تم نے ان میں سے کوئی بات کی، تو تم پر عقوبت اور سزا نازل ہوگی۔

(۴) "جنگ قادسیہ" کے موقع پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بحیثیت سفیر رستم کی فرودگاہ میں پہنچے، تو رستم نے اسلامی سفیر کو مرعوب کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا کہ خود بیچ دربار میں ایک سونے کے تخت پر جواہرات کا تاج رکھ کر بیٹھ گیا اور یہاں سے وہاں تک دورویہ زرنگار پردے لٹکائے، ریشم کے نفیس فرش بچھوائے، درباریوں کو سج دھج کر اِدھر اُدھر بٹھا دیا اور خدام کو دورویہ کھڑا کر دیا۔ رسولِ اکرمؐ کا صحابی اس ظاہری نمائش سے کب مرعوب ہوتا۔ حضرت مغیرہؓ گھوڑے سے اُترے اور

سیدھے رستم کے پاس پہنچ گئے اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ ان کی اس جرأت پر سارا دربار حیرت زدہ رہ گیا اور شاہی آداب کے خلاف سمجھا، چنانچہ ایک آدمی بڑھا اور مغیرہؓ کو تخت سے اتار دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت مغیرہؓ نے برجستہ فرمایا۔

"اے سردارانِ ایران! ہم تو تم کو عقل مند سمجھتے تھے، لیکن تم بڑے بیوقوف نکلے، ہم مسلمان بندوں کو خدا نہیں بنایا کرتے اور کمزور انسانوں پر طاقت ور لوگوں کی آقائی کے قائل نہیں، ہمارا خیال تھا کہ تمہارے ہاں بھی یہی دستور ہوگا، بہتر یہ تھا کہ تم ہمیں پہلے ہی بتا دیتے کہ تمہارے یہاں کمزور طاقت ور کی پرستش کرتے ہیں اور انہیں دیوتا بنا کر اونچی جگہ بٹھاتے ہیں، انسانیت کا اصول تمہیں تسلیم نہیں۔ اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی، تو میں ہرگز تمہارے دربار میں نہیں آتا خیر اب تو میں آگیا ہوں لیکن تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ سلطنت قائم رہنے کے یہ ڈھنگ نہیں، زیر دستوں کی بے قراری تمہارے اقتدار کی بساط الٹ دے گی۔"

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام، حاکم و محکوم کے بارے میں کیا ہے اور اسلام حکومت کے فرمانرواؤں کو کس ڈھنگ سے زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے۔

(۵) ابو مسلم خولانیؓ حضرت معاویہ بن ابو سفیانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔

السلام علیک ایھا الاجیر (اے مزدور تم پر سلامتی ہو)۔ لوگوں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہتے ہیں، یوں کہئے "السلام علیک ایھا الامیر"۔ یہ سُن کر ابو مسلم خولانیؓ نے پھر دہرایا۔

"السلام علیک ایھا الاجیر"۔

لوگ بار بار اصرار کرتے رہے کہ "ایھا الامیر" خطاب کیجئے، مگر یہ ہمیشہ "ایھا الاجیر" ہی سے خطاب کرتے رہے۔ حضرت معاویہؓ جو اس ردّ و کد کو سُن رہے تھے، فرمایا۔ "ان کو چھوڑ دو، جو کچھ کہتے ہیں، اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابو مسلم خولانیؓ نے تشریح فرمائی اور حضرت معاویہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"آپ مزدور ہیں ان بکریوں (مخلوق) کے، رب نے آپ کو ان کی حفاظت کے لئے اُجرت پر مقرر کیا ہے، اگر آپ نے ان بکریوں کے مرض کی دیکھ بھال کی اور جو بیمار ہیں ان کا دوا علاج کیا اور ان میں سے ایک کی زیادتی کرنے کو دوسرے پر روکا، تو ان بکریوں (مخلوق) کا مالک آپ کو پورا اجر عطا کرے گا اور اگر آپ نے ان باتوں میں کوئی ذمہ داری نہ ادا کی، تو مالک سزا دے گا۔"

طلوعِ اسلام اگست ۱۹۵۵ء سے ماخوذ)

محمد ارشاد۔ مری

موجودہ انسان

(ایک نقطۂ نظر)

کرۂ ارض پر زندگی خاک اور پانی کے امتزاج سے اُبھری۔ اس ارضی کائناتی لیبارٹری میں کرۂ ہوائی، سورج، چاند ستاروں اور کہکشاؤں سے آنے والی روشنی، شعاعوں اور لاشعاعوں نے جو کام کیا، ہم اس کا تجزیہ اور اندازہ نہیں کر سکتے۔ سائنس دان اس کا ایک دھندلا سا تصور پیش کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ زندگی نباتات میں جلوہ گر ہوئی۔ قرآن کو ماننے والے ہم صاحبِ ایمان یہ کہیں گے کہ خدا نے اپنی کائناتی لیبارٹری میں نباتات کو پیدا کیا۔ یہ اس کے عالمِ امر اور عالمِ خلق میں کُن فیکون سے ہوا۔

۲۔ وہ کہتے ہیں کہ نباتات کے بعد نباتی خلیہ ارتقاء سے حیوانی خلیہ میں تبدیل ہوا۔ قرآن کو ماننے والے ہم صاحبِ ایمان یہ کہتے ہیں کہ۔

عالمِ نباتات کی تخلیق ایک دَور تھا جس کے کچھ تقاضے تھے۔ جب وہ پورے ہو چکے، تو قادرِ مطلق نے عالمِ امر اور عالمِ خلق میں کن فیکون سے حیوانی خلیہ پیدا کیا کیونکہ اس خلیہ کے ارتقاء کے لئے خاک، پانی اور عالمِ نباتات کو بنیاد بنایا گیا۔ اگر عالمِ نباتات کا ظہور پہلے نہ ہوتا، تو عالمِ حیوانات کی بنیادِ ارتقاء قائم نہ ہو سکتی۔ اس طرح حیوانی خلیات سے کرۂ ارض پر انواعِ حیوانات کا ارتقاء جاری رہا۔ جس کا ثبوت ارضی تحقیقات ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے ذریعے زمانۂ قدیم کی انواعِ حیوانات کے ڈھانچے مل چکے ہیں۔

۳۔ حیوانی ارتقاء میں موجودہ انسان کا کیا مقام ہے؟ اس سوال کا جواب مختلف ذرائع سے مختلف رہا ہے۔ اگر انسان اسی دنیا کا باسی ہے، تو ہمیں اس کے ارتقاء کا قائل ہونا پڑے گا۔ اگر عالمِ نباتات اور حیوانات کی تخلیق مٹی اور پانی سے ہے تو انسان کی تخلیق بھی اسی سے ماننا پڑے گی۔ قرآن کریم میں انسان کی پیدائش کے بارے میں مٹی اور پانی کا تذکرہ ملتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ انسان اسی دنیا کا باسی ہے، کسی دوسرے کرۂ آسمانی سے یہاں وارد نہیں ہوا۔

اب اس بات کا طے کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ انسان کس نوع سے یہاں تک آیا۔ بندر، بن مانس اور جنگلی انسان کے

مختلف رُوپ ملتے ہیں۔ اگر ہم عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات میں خدائی امر اور خلق پر یقین رکھتے ہیں، تو انسان کی پیدائش پر اسے کیوں نظر انداز کر دیا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے انسان بطور حیاتیات الگ ہوا اور یہ سب خدائی پروگرام تخلیق کا حصّہ ہے۔

مہذّب انسان کی تاریخ صرف بیس ہزار سال تک پیچھے لے جائی جا سکتی ہے۔ جبکہ انسانی ڈھانچے ملنے کی تاریخ دو لاکھ سال تک پیچھے جاتی ہے۔ لہٰذا اس مقام پر یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ دیگر حیوانات کی طرح پابندِ فطرت انسان لاکھوں سال پہلے پیدا کر دیا گیا تھا۔ وہ دیگر حیوانات کی طرح رہتا تھا۔ درختوں پر بسیرا کرتا تھا۔ غاروں میں رہتا تھا۔ پھل کھا کر گزارہ کرتا تھا۔ اس انسان کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے کہ "بے شک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا" (۷۶/۱)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی انسان پر خاص الخاص نظرِ کرم فرمائی اور اس کو (انسانی انا) مَیں، خودی، روح، ذات (PERSONALITY) دی گئی۔ (۳۲/۷)

۴۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے انسان اور انسان میں فرق نظر آتا ہے۔ یہاں بندر سے انسان کی بحث نہیں کی جا سکتی بلکہ انسان سے انسان کی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ جب انسان کو روح، خودی مل گئی، تو اس وقت وہ اتنا آزاد اور بااختیار ہو چکا تھا کہ وہ دیگر حیوانات (مثلاً بندر وغیرہ) کی طرح پابندِ فطرت نہیں رہا تھا بلکہ آزاد فطرت ہو گیا تھا۔

تفریق کا یہ وہ مقام ہے جہاں پابندِ فطرت انسان اور آزاد فطرت انسان کا مقابلہ شروع ہوا۔

منشائے ایزدی کے مطابق حیواناتِ پابندِ فطرت تھے اور انسان بھی پابندِ فطرت رہ چکا تھا۔ اس کو سمع، بصر، فؤاد کے ساتھ انا، خودی بھی مل گئی۔ اسی ضرورت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے بذریعہ حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام وحی کے ذریعے ہدایات دی جانے لگیں۔ اب حیوانات کی فطرت کی زندگی تھی اور انسان کی فطری زندگی یوں بنتی تھی کہ خدائی رہنمائی یعنی وحی کے مطابق چلے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

۵۔ تجربات نے انسان نے بہت کچھ سیکھا۔ اب وہ وقت آگیا جب انسان شعوری طور پر ایک ہدایت پر عمل کر کے کرۂ ارض پر اپنی زندگی کو پُرسکون بنا سکے۔ لہٰذا اسے ایک آخری کتاب قرآنِ کریم دے دی گئی۔

حیوانات پابندِ فطرت ہیں اور انسان ...؛ قرآن ہی فطرت کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وزیرِ اعظم کا مشن

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں کہ یہ چار سُو بدل جائے (اقبالؒ)

وزیرِ اعظم کا عزم

کتنا خوش آئند ہے ہمارے وزیرِ اعظم، جناب محمد نواز شریف صاحب کا یہ عزم، جس کا وہ ہر چھوٹے بڑے عوامی اجتماع میں اعادہ کرتے رہتے ہیں کہ "ان کی حکومت پاکستان سے محبت کرنے والی حکومت ہے جو انشاء اللہ پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی مملکت بنانے کے مشن میں کامیاب ہو گی" (سیالکوٹ 24 نومبر 1991ء)۔ ان کے سیاسی مخالفین تو ان کے اس نیک مشن کو بھی سیاست چمکانے کا ایک حربہ ہی قرار دیں گے لیکن قوم کی باشعور اور خاموش اکثریت جانتی ہے کہ پاکستان کے لئے ایک خطۂ زمین کا حصول، مقصود بالذّات (END IN ITSELF) نہیں تھا، بلکہ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور وہ مقصد ہے اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی مملکت کا قیام۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وزیرِ اعظم کا مشن ہی ملّتِ پاکستان کی اصل منزل ہے۔ یہ ہماری انتہائی خوش نصیبی ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے بعد، ملّتِ پاکستان کو ایک ایسا "سخن دلنواز" والا رہبر مل گیا، جو "نگہ بلند" بھی رکھتا ہے اور "جان پرسوز" بھی، اور ملّتِ پاکستان کے کارواں کو اس کی اصل منزل تک پہنچانے کا عزم بھی۔ "یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے"۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس عزم کو پختہ سے پختہ تر کر دے۔ آمین

ارشادِ خداوندی ہے کہ **فاذا عزمت فتوکل علی اللہ** ... ط (3 : 158)۔ رسولؐ اللہ کی وساطت سے ہمیں بتایا گیا ہے کہ "تمہارا عزم ایسا پختہ ہونا چاہئے کہ جب باہمی مشاورت کے بعد، تم کسی بات کا فیصلہ کر لو تو پھر اپنے ربّ کے قانون کی محکمیت پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے اس فیصلہ کو عمل میں لانا شروع کر دو۔ یہی روش ہے جو اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ ہے"۔ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ "اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی مذموم ہے، قابلِ گرفت ہے، کہ ایسی باتیں کی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے"۔ (3 : 61)۔ اُمید تو یہی ہے کہ وزیرِ اعظم اسے کر بھی دکھائیں گے جو وہ زبان سے کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے جلسوں میں کہا کرتے ہیں کہ "نواز شریف جو کہتا ہے وہ کر کے بھی دکھاتا ہے"۔

انہوں نے قوم کی "خودی کو مسلمان" کرنے کے لئے اسے خود انحصاری اور خود اعتمادی کا جو نعرہ دیا ہے اس سے

بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "یہ چارٹسو" بدلنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں تاکہ جس مملکت کا خواب علامہ اقبالؒ کی چشمِ بینا نے دیکھا اور جس کا تصوّر قائدِ اعظمؒ کی نگہِ بلند نے دیا' حقیقت بن کر سامنے آ جائے۔ حقیقتِ منتظر "لباسِ مجاز" میں نظر آ جائے۔ اللہ ان کے اس ارادہ کو جنوں میں بدل دے۔ آمین

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے پاکستان کا خطّۂ زمین اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے ہی حاصل کیا تھا' لیکن ہماری بد نصیبی کی انتہا ہے کہ اس قسم کی مملکت کا قیام تو ایک طرف' یہاں ابھی تک یہی طے نہیں پایا کہ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے؟ اس کے لئے مجالسِ مذاکرات قائم ہوتی ہیں' علماء اور مشائخ کے سیمینار منعقد کرائے جاتے ہیں' دانشورانِ قوم' بالخصوص قانون دان حضرات میں بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے' لیکن ان تمام کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ : ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا نہیں ملتا

اسلامی نظام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم متعیّن طور پر سمجھیں کہ اسلام کیا ہے۔ اگر یہ بات سمجھ میں آ جائے تو اسلامک آئیڈیالوجی' (اسلامی نظریۂ حیات) اسلامی نظام' اسلامی مملکت' اسلامی قوانین' اسلامی شریعت غرضیکہ اسلام کے متعلق سب کچھ باآسانی سمجھ میں آ جائے گا اور ہم وہ بنیادی غلطی بھی نہیں کریں گے جو اس سلسلے میں ہم اکثر کرتے ہیں۔

بنیادی غلطی

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں مملکت کو اسلامی بنانے کا' لیکن اپنے سامنے نقشہ رکھتے ہیں مغربی نظامِ سیاست کا۔ جب کوئی اسلامی اصول' مغربی نظامِ سیاست سے ٹکراتا ہے تو یا تو ہم کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی اصول کو کسی نہ کسی طرح مغربی نظام کے مطابق ڈھال لیں اور اگر ایسا ہونا ممکن نہ ہو تو پھر اسلامی اصول کو ناممکن العمل قرار دے کر' اس سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ (مثال کے طور پر قرآنِ حکیم کی بدنی سزائیں) ۔ یہ سب اشکال اس غلط فہمی کا نتیجہ ہیں جس کی رُو سے ہم نے مغرب کے انداز و نظامِ سیاست کو معیار قرار دے رکھا ہے۔ اگر ہم معیار اللہ تعالیٰ کی متعیّن کردہ ابدی اقدار (PERMANENT VALUES) و اصولوں کو قرار دیں جو قرآنِ حکیم کے اندر ہیں تو پھر ہمیں ایسا نظام وضع اور اختیار کرنا ہوگا جو ان معیاروں پر پورا اترے اور اسلام کے کُلّی تقاضوں کو پورا کر سکے' خواہ یہ نظام دنیا جہان سے نرالا ہی کیوں نہ ہو۔

تو آیئے پہلے سمجھیں کہ اسلام کیا ہے تاکہ اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کے خدّو خال نکھر کر سامنے آ جائیں۔

اسلام کیا ہے؟

ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ ہمارے ایمان پر مبنی ہے) کہ اسلام اللہ کی طرف سے عطا کردہ' آخری اور مکمل

دین (ضابطۂ حیات) ہے جو نوعِ انسانی کی تمام مشکلات' یعنی زندگی کے تمام بنیادی مسائل' کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے تو اس کے جواب میں مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور جب ان آوازوں کو یکجا کیا جائے تو' ان کا ماحصل نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب ظاہر ہے کہ جس اسلام کا تصوّر صرف اس قدر ہو وہ (تمام نوعِ انسان کی مشکلات تو ایک طرف خود) مسلمانوں کی مشکلات کا حل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے' جس کی بنیادیں چند مستقل اقدار (PERMANENT VALES) پر قائم ہیں۔ جب تک یہ بنیادی مستقل اقدار واضح' غیر مبہم اور متعیّن طور پر سامنے نہ آ جائیں' یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ وہ نظامِ زندگی ہے کیا جسے اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو زندگی کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان اقدار کی' جنہیں اسلام کی بنیاد کہہ کر پیش کیا جاتا ہے' سند کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آسان ہے۔ قرآنِ حکیم اسلام کا ضابطۂ قوانین ہے۔ لہٰذا اسلامی اقدار وہ ہیں جن کی سند قرآنِ حکیم سے مل جائے۔ یہ حکومتِ وقت اور اس کے سربراہ کی اہم ترین ذمّہ داری ہے کہ ان بنیادی اور مستقل اقدار (PERMANENT VALES) کو قرآن سے اخذ کر کے ان کا متّفق علیہ مفہوم متعیّن کرے تاکہ فرقہ پرستی کی لعنت سے جس نے ملّتِ پاکستان کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے نجات حاصل ہو سکے۔

آیئے چند مثالوں سے سمجھیں کہ وہ مستقل اسلامی اقدار کیا ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ زندگی بھی جنّت کی زندگی بن جاتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی سرفرازیوں اور کامرانیوں کی ضامن۔

چند مستقل اقدار کا تعارف

انسانی ذات۔ اسلامی نظام کی ساری عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں بلکہ جسم کے علاوہ' اسے ایک اور شے بھی عطا ہوئی ہے' جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا علامہ اقبالؒ کی اصطلاح میں خودی (EGO) یا انا (I-AM -NESS) کہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اس شے کیلئے "نفس" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جب قرآنِ حکیم' تخلیقِ انسانی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد' کہتا ہے کہ ونفخ فیہ من روحہ (9 : 34 :: 14 : 23) "اللہ نے اس میں اپنی توانائی پھونک دی"۔ تو اس سے مراد یہی انسانی ذات ہے۔ واضح رہے کہ انسانی ذات' ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں' یہ توانائی اللہ کی عطا کردہ ہے۔

مکمل ترین ذات اللہ کی ہے اور اس کے بعد' محدود پیمانے پر' اللہ کی عطا کردہ' انسانی ذات۔ انسان کو اس کی

ذات غیر نشوونما یافتہ حالت میں ملتی ہے' انسانی زندگی کا مقصد اس کی نشوونما ہے۔ جسم اور ذات کی نشوونما کے قوانین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا استعمال کرے۔ اس کے برعکس' انسانی ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT) ان چیزوں سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ دوسروں کی پرورش (ربوبیت) بھی ایک مستقل اسلامی قدر ہے جس سے ہماری ذات مستحکم ہوتی ہے۔ انسانی ذات میں اس امر کا امکان ہے کہ وہ ان صفات کو چھوڑ کر جو ذاتِ خداوندی سے مخصوص ہیں اور جن میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا مثلاً **ھوالاول والاخر** وغیرہ) صفاتِ خداوندی کو' علیٰ حدِّ بشریت' اپنے اندر منعکس کرتی جائے۔ اس بنا پر اللہ کی صفات ہمارے لئے معیار بنتی ہیں یہ پرکھنے کے لئے کہ ہماری ذات کس حد تک نشوونما یافتہ ہو چکی ہے۔

اسلامی مملکت کا فریضہ۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے اور انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری اسباب و ذرائع فراہم کرنے کی ذمّہ دار ہو۔ ("ذمّہ دار" کا لفظ قابلِ غور ہے) یاد رہے کہ "ذات کی نشوونما" میں قلب و دماغ (HEAD AND HEART) کی تمام صلاحیتوں کی نشوونما آ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ کی صفت علیم اور خبیر ہے' لہٰذا اس فرد کا جس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو' علیم و خبیر (صاحبِ علم اور باخبر) ہونا لازمی ہے۔ اس کے لئے ذہنی نشوونما ضروری ہے۔ دوسری طرف اللہ کی صفت ربوبیت اور رزاقیت ہے اس لئے جس فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا جذبہ اپنے اندر رکھے اور ان کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے ہر فردِ ملّت کی ان صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے اور اس طرح یہ معاشرہ صفاتِ خداوندی کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائے۔

سو پہلی مستقل قدر ہے' انسانی ذات کی نشوونما۔

احترامِ آدمیت۔ چونکہ انسانی ذات ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر ملتی ہے اس لئے ہر انسان' محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام قرار پا جاتا ہے۔ **ولقد کرمنا بنی اٰدم** (17 : 70) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ اس اعتبار سے' نہ کسی انسان کو' انسان ہونے کے لحاظ سے' کسی دوسرے انسان پر کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ ہی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے مقابلہ میں ذلیل ہے۔ لہٰذا' احترامِ آدمیت ایک مستقل قدر ہے جسے کسی مفاد اور مقصد کی خاطر کسی حالت میں بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سے ذات پات' حسب و نسب اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی مساوات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا' دوسری مستقل قدر "احترامِ آدمیت" ہے۔

کوئی کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ انسانی ذات کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ذات' کسی دوسری ذات

کے مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ یا آلۂ کار نہیں بن سکتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ :-

(1) جب ذات ہر انسان کو یکساں طور پر عطا ہوئی ہے اور

(2) کوئی ذات کسی دوسری ذات کا آلۂ کار نہیں بن سکتی

تو کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم و محتاج نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ حکیم کا اس باب میں واضح فیصلہ ہے کہ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ اسے ضابطۂ قوانین اور فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر' میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ" (3:78) - لہٰذا فرد کی آزادی اور اس کا احترام ایک بنیادی اور مستقل قدر ہے' جسے کسی حالت میں بھی پامال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ کہن کی شخصی حکومت ہو یا عصرِ حاضر کی جمہوریت' اس میں انسان بہرحال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے' حکومت کا یہ طریقہ یکسر غیر قرآنی ہے۔

لہٰذا تیسری مستقل قدر ہے ہر فرد کی آزادی اور اس کی آزادی کا احترام۔

حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ شرفِ انسانیت کا تحفّظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق اس ہستی کو ہو جس کا ان احکام و قوانین کے نفاذ میں اپنا ذاتی مفاد کوئی نہ ہو۔ ظاہر ہے ایسی ہستی انسانوں سے بالا ہی کوئی ہستی ہو سکتی ہے۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں انہیں مومن' یعنی اللہ پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں' صرف اللہ کو حاصل ہے (3:78' 12:40)- وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا (18:26)-

لیکن اللہ تعالیٰ کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں' نہ اس کی آواز سن سکتے ہیں' اس لئے ہم اپنے معاملات کے فیصلے اس سے کس طرح کرا سکتے ہیں؟ ہم اس کی محکومیت کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ محکومیت ان قوانین کی اطاعت سے اختیار کی جائے گی جنہیں اس نے اپنے آخری رسولؐ کی وساطت سے بذریعہ وحی دیا اور جو' اب قرآنِ حکیم میں محفوظ ہیں۔ "جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے دل و دماغ میں منقوش کرتے رہتے ہو" (3:78)- اور نبی اکرمؐ کی زبانی کہلوا دیا کہ "کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم چاہوں' حالانکہ اس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے" (6:115)- چونکہ یہ قوانین تمام انسانوں پر یکساں نافذ ہوتے ہیں اس لئے اسلامی مملکت میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا' حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں ہوتا۔ جسے عُرفِ عام میں "حکومت" یا "مملکت" کہا جاتا ہے وہ اسلامی نظام میں اللہ کے عطا کردہ قوانین کو نافذ کرنے کی ایجنسی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے (جو حکومت' اللہ کی

کتاب کے مطابق قائم نہیں ہوتی) تو یہی تو وہ لوگ ہیں جو کافر ہیں (5:44)۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں اطاعت کسی انسان کے حکم کی نہیں ہو گی' صرف ان قوانین کی اطاعت ہو گی جو اللہ کی کتاب میں دیئے گئے ہیں۔ یہ ہے بلند ترین قرآنی قدر۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اب تک اس قرآنی قدر کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں کر سکے ہیں۔ "قرآن و سُنّت" کی اصطلاح کی تشریح و تعبیر میں ایسے الجھے ہیں کہ اب ہر مذہبی فرقے کی "قرآن و سُنّت" الگ الگ ہے۔

(دستور کا آرٹیکل نمبر 227)

نوعِ انسان ایک امت ہے۔ اپنی تقدیر سنوارنے کے لئے ہمیں اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھنا ہو گا کہ قرآن کا منتہیٰ' وحدتِ قانون کی بنیاد پر' تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ **کان الناس امۃً واحدۃ** (2 : 213)۔ "تمام نوعِ انسانی ایک قوم تھی" اور یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔ سو جو نظام تمام انسانوں کو ایک برادری کے قالب میں ڈھالنے کا پروگرام اپنے سامنے رکھتا ہو' وہ خود اپنے اندر فرقوں اور پارٹیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانوں کی تقسیم کا معیار ایک ہی ہے' یعنی کفر اور ایمان (64:2)۔ نوعِ انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے وہ آغازِ کار کے طور پر ایک اُمّت تشکیل کرتا ہے جسے وہ اُمّتِ مسلمہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس اُمّت کی وحدت' توحید کی مظہر ہے۔ اس لئے تفرقہ (فرقہ بندی) اس کے نزدیک شرک اور کفر ہے (30:31-32)۔ رسولؐ اللہ سے کہا گیا ہے کہ ایسے لوگوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں جو دین میں فرقے پیدا کرتے ہیں (6:160)۔ باہمی اختلافات اس کے نزدیک اللہ کا عذاب ہے (3:104) اور اس سے محفوظ رہنا اللہ کی رحمت (11:118)۔ ہم ان آیات کو خوب جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں لیکن غیر قرآنی روش نہیں چھوڑتے۔

آپ سوچئے کہ کہاں اُمّت کا یہ مقصد کہ تمام اقوامِ عالم کے اختلافات مٹا کر' انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے اور کہاں اس اُمّت کی اپنی یہ حالت کہ دو مسلمان خانۂ خدا میں رُو بہ قبلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے! یہ ہے فرقہ پرستی کا نتیجہ اور اس کی واحد ذمّہ دار ہے مذہبی پیشوائیت جو مروّجہ مذہب (فرقوں والے اسلام) کو دینِ خداوندی بتا کر اُمّت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھتی ہے۔ یہ ہمارے کانوں میں یہ سحر پھونک دیتی ہے کہ تمہارے فرقے' وہ فرقے نہیں جنہیں قرآن شرک قرار دیتا ہے' یہ "مکاتبِ فکر" ہیں۔ اس نے الفاظ کے ذرا سے پھیر سے اس شرک (فرقہ پرستی کے شرک) کی گرہیں اور مضبوط کر دیں لیکن الفاظ کے بدل جانے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ سنکھیا تو سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔

لہٰذا پانچویں مستقل قدر ہے تمام نوعِ انسانی کا ایک ضابطۂ حیات کے مطابق ایک اُمّت بن کر رہنا۔

یاد رہے قرآنِ حکیم کا منتہیٰ و مقصود وحدتِ انسانیہ ہے۔

اُمّت میں فرقہ پرستی کے شرک (30 : 31-32) کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (3:102)۔

"تم سب کے سب' بلا استثناء' اجتماعی طور پر' اللہ کے نظام کے ساتھ' محکم طور پر' وابستہ رہو اور اُمّت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو"۔

یہ ہے مستقل اسلامی اقدار کا مختصر سا تعارف۔

مستقل اقدار تو اور بھی ہیں مثلاً انفاق' تعاون' محروم کا حق' عدل و احسان' مشاورت' معیار قومیت' ناروائی ظلم' جرم کی پاداش' مدارج بہ اعتبارِ عمل' قانون کے مطابق چلانا' رزق کی ذمّہ داری (کوئی بھوکا نہ رہے)' ربوبیت (دوسروں کی پرورش)' حفاظتِ عصمت' امورِ مملکت نااہلوں کے سپرد نہ کئے جائیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان پر تبصرہ اس مضمون کو طویل بنا دے گا۔ اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ اسلامی نظریۂ حیات (اسلامک آئیڈیالوجی) انہی مستقل اقدار یا غیر متبدّل اصولوں کے مجموعہ کا نام ہے جو اپنی مکمل شکل میں قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔ جب کوئی مملکت ان اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے لے تو اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں۔

اسلامی مملکت' مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین ملّت کی مشاورت سے خود مرتّب کرتی ہے۔ ان جزئی قوانین میں حسبِ ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی ہے' لیکن مستقل اقدار اپنی جگہ غیر متبدّل رہتی ہیں۔ اس طرح' ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے معاشرہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ایسی ہی اسلامی مملکت کا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا اور ایسی ہی مملکت کا تصوّر قائدِ اعظمؒ نے قوم کو دیا تھا۔

علامہ اقبالؒ کا تصوّرِ پاکستان

پاکستان کا تصوّر' علامہ اقبالؒ نے اپنے الٰہ آباد (مسلم لیگ) کے خطبۂ صدارت میں' 1930ء میں پیش کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ:-

"مسلم لیگ کا میرا یہ مطالبہ' ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہو گا۔ ہندوستان کو اس سے حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسّر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپّہ کو مٹا سکے گا جو عرب (ملوکیت) نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین' تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے"۔

علامہ اقبالؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں' اسلام کو موقع میسّر آ جائے گا کہ یہ اس "ٹھپّے"

کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جس کی طرف وہ چند لفظوں میں اشارہ کر گئے ہیں۔ ہمارے ہاں جو اسلام اس وقت بالعموم مروّج ہے وہ بہ ہیئتِ مجموعی' ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ علامہ اقبالؒ یہ چاہتے تھے کہ اگر پاکستان کا خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں حقیقی اسلام کو پھر سے عملاً متشکل کیا جائے جو عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہٗ میں وجہِ تابانیٔ عالم تھا۔ اس طرح اسلام سے وہ "ٹھپہ" مٹ سکے گا جو اس پر عرب ملوکیت نے صدیوں سے لگا رکھا ہے۔ یعنی پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گا اور اس میں اسلام اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں رائج ہو گا۔

قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان

قائدِ اعظمؒ نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ ایک خطۂ زمین کا حصول' ہمارے لئے مقصودِ حیات نہیں' یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ہے اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی مملکت کا قیام۔ اکتوبر 1947ء میں (خالق دینا ہال' کراچی میں) عمالِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے' اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے' لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذّات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لا سکیں"۔

اسلام کے عدلِ عمرانی کے وہ اصول کیا ہیں جنہیں بروئے کار لانے کے لئے قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ اسلام کا منتہیٰ یہ ہے کہ ہر فرد کی تمام مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد حیاتِ اُخروی میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے افراد کو زندگی کی بنیادی ضروریات (خوراک۔ لباس۔ مکان وغیرہ) کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے تاکہ وہ اطمینان سے بلند مقاصد انسانیت کے حصول کے لئے جدّوجُہد کر سکیں۔ اس کے لئے اسلامی نظام مملکت' تمام افرادِ مملکت کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ہم اللہ کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریات زندگی کا ذمّہ لیتے ہیں۔ اس کا نام اسلام کا عمرانی عدل ہے۔ اس کا دوسرا نام فلاحی اسلامی مملکت ہے جس کے قیام کے لئے ہمارے وزیر اعظم کوشاں ہیں۔ لیکن یاد رہے یہ وہ چیز نہیں ہے جسے جدید (فلاحی) مملکت کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت اور جدید مملکت میں زمین آسمان کا فرق ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پہلے جدید مملکت کو لیجئے۔

جدید مملکت

مملکت کی تعریف کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ وہ بلند ترین معاشرتی ادارہ جو انسانوں کے تمدنی معاملات کو قانون اور ضابطہ کی رُو سے انجام دینے کے لئے وجود میں آتا ہے' اسے مملکت کہتے ہیں۔ ہمارے دور میں جدید (مغربی) مملکت کی تین بنیادی خصوصیات بتائی جاتی ہیں :-

(1) اول یہ کہ مملکت کو مذہب اور اخلاق سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی مملکت' افراد کے مذہب اور پرائیویٹ کیریکٹر کے معاملہ میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت خود کسی ضابطۂ اخلاق کی پابند نہیں ہوتی۔ مغرب (اور اس کی دیکھا دیکھی باقی دنیا میں بھی) مملکت کی عمارت میکیا وَلی کے نظامِ سیاست کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس نظام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ مملکت کو ہر قسم کے ضابطۂ اخلاق سے آزاد ہونا چاہئے اور اس کا مقصد مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ ہر وہ اقدام جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے جائز بلکہ مستحسن ہے۔

(2) دوسرے یہ کہ مملکت ہمہ گیر ہوتی ہے' یعنی وہ افراد کی پوری زندگی پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اور اپنے عمل اور فیصلوں کے لئے کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتی۔ یعنی وہ اپنے سے بالا کسی قوت کو تسلیم نہیں کرتی۔ جس طرح ایک مطلق العنان بادشاہ اپنے حکم کو آخری لفظ قرار دے کر نافذ کر دیتا ہے' اسی طرح جدید جمہوری نظام میں اکیاون فیصد اکثریت والے اپنے فیصلہ کو کامل اختیارات کے ساتھ نافذ کر دیتے ہیں اور وہ اپنے اس فیصلے کے لئے کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔

(3) اور تیسرے یہ کہ مملکت اپنی قوت' وطنیت کی گروہ بندی سے حاصل کرتی ہے۔ وطنیت کا عمومی مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ ایک خطہ زمین (جغرافیائی حدود) میں بسنے والے افراد جو ایک حکومت کے ماتحت زندگی بسر کریں ایک نیشن ہوتے ہیں۔ نیشن کا مفاد باقی تمام مفادات پر غالب ہوتا ہے۔ اپنی نیشن کے تحفظ کے مقابلہ میں باقی افرادِ انسانیہ کا تحفظ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں جدید مملکت کی بنیادی خصوصیات۔ قرآنِ حکیم جس بنیاد پر مملکت کی عمارت تعمیر کرتا ہے' اس کی رُو سے جدید مملکت کی تینوں خصوصیات باطل ہو جاتی ہیں۔

اسلامی مملکت

قرآنِ حکیم مملکت کی عمارت آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) پر استوار کرتا ہے - آپ دیکھیں گے کہ اس ایک فرق سے جدید مملکت کے تصوّر اور مملکت کے قرآنی تصوّر میں کتنا بنیادی فرق آ جاتا ہے - سب سے پہلے تو یہ کہ قرآنی

مملکت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی کہ اس کے افراد کس آئیڈیالوجی کو تسلیم کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن کی رُو سے آئیڈیالوجی ہی کا دوسرا نام دین اور ایمان ہے' اس لئے قرآنی مملکت میں افرادِ مملکت آئیڈیالوجی کے معاملہ میں بے زمام نہیں رہ سکتے۔

اس قرآنی مملکت میں دو گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ وہ جو قرآنی آئیڈیالوجی پر یقین رکھے اور دوسرا گروہ وہ جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے (64:2)۔ مملکت کا نظم و نسق پہلے گروہ کے ہاتھ میں ہو گا - باقی رہا دوسرا گروہ' سو اس کے تمام انسانی حقوق کی ذمّہ داری اسلامی (قرآنی) مملکت کے سر پر ہو گی۔ وہ دیکھے گی کہ ان کے حقوق میں کسی قسم کی دست برد نہ ہونے پائے۔

آئیڈیالوجی کے پیشِ نظر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنی مملکت مختارِ کل نہیں ہوتی' بلکہ یہ اس آئیڈیالوجی کی عائد کردہ حدود کے اندر ہی فیصلے صادر کر سکتی ہے۔ یہ ان حدود کو کسی صورت میں بھی توڑ نہیں سکتی۔ نہ اپنے آپ کو ان پابندیوں سے اُونچا لے جا سکتی ہے۔ یہ پابندیاں غیر متبدّل ہیں اور ان میں تغیر و تبدّل یا ترمیم و تنسیخ کا مملکت کو کوئی حق نہیں ہوتا۔

آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) کے ماتحت وطنیت کا تصوّر بھی باطل ہو جاتا ہے - اس کی رُو سے قومیت کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہوتی ہے نہ کہ وطن' رنگ' نسل' زبان وغیرہ کے اشتراک پر۔ خود ایک ہی وطن میں بسنے والے جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح تسلیم نہیں کرتے غیر قوم کے افراد کہلائیں گے اور اس کے برعکس دنیا کے کسی حصہ میں بسنے والا انسان جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح تسلیم کرتا ہے اس قوم کا فرد قرار پائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک فرق کی بنا پر قرآنی (اسلامی) مملکت کس طرح جدید مملکت سے یکسر منفرد ہو جاتی ہے۔ خواہ یہ مملکت جمہوری نظام کی حامل ہو یا آمریت کے نظام کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) کیا ہے جس پر اسلامی مملکت متشکل ہوتی ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں ____ یہ آئیڈیالوجی ہے :-

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

یعنی وہی چیز جسے ہم کلمہ کہتے ہیں۔ کلمہ کے معنی ہی نظریۂ زندگی یا تصوّرِ حیات کے ہیں۔ اسی کو دور حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس آئیڈیالوجی کے تین اجزا ہیں۔

پہلا جزو' **لا الٰہ**- اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں کوئی قوت ایسی نہیں کہ جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ ذرا غور کیجئے کہ قرآن نے اس نظریۂ حیات سے انسان کا مقام کس قدر بلند کر دیا ہے۔ اس نے انسان کو وہ آزادی عطا کر دی ہے جو کسی کے تصوّر میں بھی نہیں آ سکتی۔ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ انسان اپنا حکم اشیائے فطرت سے تو منوا سکتا ہے لیکن کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے (3:78)- سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اگر انسان کسی کا حکم نہ مانے تو پھر انسانی معاشرہ کیسے قائم رہے گا؟ اس کا جواب کلمہ کے اگلے جزو میں ہے۔

دوسرا جزو' **الا اللہ**۔ کلمہ کے دوسرے جزو نے انسانوں کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرے میں فساد (ANARCHY) کو ختم کر دیا جب اس نے کہا کہ ____ الا اللہ ____ ہاں مگر ایک ذات ایسی ہے جس کے قانون کی پابندی ضروری ہے اور وہ ذات ہے اللہ کی۔ اللہ کے قوانین کی اطاعت کے معنی ہوتے ہیں مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ سورۂ آل عمران کی جس آیت کا پہلا ٹکڑا پہلے پیش کیا جا چکا ہے (یعنی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے) اس کا اگلا ٹکڑا یہ ہے۔ **ولکن کونوا ربانیین** ..... (3:78) لیکن تمہیں چاہئے کہ تم ربّانی بن جاؤ" (یعنی اللہ کے عطا فرمودہ ضابطۂ قوانین کے علمبردار بن جاؤ) اس نفی اور اس اثبات سے قرآنی آئیڈیالوجی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

تیسرا جزو' **محمد رسول اللہ** اور کلمہ کے تیسرے جزو میں بتا دیا گیا ہے کہ یہ قوانینِ خداوندی انسانوں کو رسالتِ محمدیہؐ کی وساطت سے ملیں گے۔ اس کی وضاحت سورۂ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تیسرے ٹکڑے میں کر دی جس میں کہا گیا ہے کہ یہ قوانین ملیں گے اس کتاب (القرآن) کے ذریعہ سے جو تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے نقوش تمہارے لوحِ قلب پر نہایت گہرے ہیں (3:78)۔

لہٰذا' اسلامی مملکت کے معنی ہوئے ____ انسانی معاشرہ کی تشکیل قرآنی قوانین کے مطابق ____ یہی چیز قرآن نے سب سے پہلے خود نبی اکرمؐ سے فرما دی جب آپ کو حکم دیا کہ **فاحکم بینھم بما انزل اللہ** (5:48) کہ تم قرآن حکیم کے مطابق حکومت قائم کرو۔ اور اس اصول کو اس نے کفر و ایمان کا معیار قرار دیا جب کہا کہ **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون** (5:44)۔

جو قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (یعنی قرآنی آئیڈیالوجی کے منکر ہیں)۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظریہ کی عملی صورت کیا ہے؟

نظریۂ حیات کی عملی صورت

آپ انسانی زندگی پر غور کیجئے۔ اس کے کچھ تقاضے تو ایسے ہیں جن میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ زندگی کے یہ غیر متبدّل تقاضے بنیادی اور اصولی ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہتے ہیں۔ لیکن زندگی کے دوسرے تقاضے ایسے ہیں جو زمان اور مکان کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ مستقل اقدار یا بنیادی اصول تو اپنی جگہ پر محکم رہتے ہیں لیکن ان کی عملی جزئیات مختلف زمانوں میں بدلتی جاتی ہیں۔ قرآن نے زندگی کے ان بدلتے اور نہ بدلنے والے دونوں پہلوؤں کے متعلّق رہنمائی دی ہے۔ یہ مستقل اور غیر متبدل

اقدار وہ حدود ہیں جن کے اندر انسانوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی جزئیات خود متعین کر لیں۔ اس کی بابت سب سے پہلے خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ **وشاورھم فی الامر** (3:158) "مملکت کے معاملات میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو"۔ اور نبی اکرمؐ کے بعد' جماعت مومنین کے متعلق کہا کہ **وامرھم شوری بینھم** (42:38) ان کی مملکت کے امور باہمی مشورہ سے طے پائیں گے"۔ دوام اور تغیر (PERMANENCE AND CHANGE) کے اس فطری امتزاج کی رو سے یہ نظامِ مملکت ارتقائی منازل طے کرتا' بڑھتی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کرتا چلا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے شوریٰ کا اصولی حکم دیا ہے' اس کی جزئیات سے بحث نہیں کی۔ شوریٰ کی عملی مشینری زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی جائے گی۔ لیکن یہ شوریٰ جمہوریت کی بدلگامی کا مظہر نہیں ہو گا' (مثلاً ایسی "بدلگامی" جیسی' 19 دسمبر 1991ء کو صدرِ پاکستان کے خطاب کے دوران' قومی اسمبلی میں دیکھی گئی)۔ اس لئے کہ یہ اختیار کسی کو بھی نہیں ہو گا کہ وہ ان حدود سے تجاوز کر جائے جو قرآن نے مستقل طور پر متعین کر دی ہیں۔ شورائی فیصلے ان حدود سے تجاوز کر جائیں گے تو وہ مملکت قرآنی (اسلامی) نہیں رہے گی۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے مملکت مقصود بالذّات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے صحیح اسلامی مملکت کا قیام جس میں افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما قوانین خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔

خلاصۂ مبحث

(1) اسلامک آئیڈیالوجی (اسلامی نظریۂ حیات) ان مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کا نام ہے جو قرآنِ حکیم میں مذکور ہیں۔

(2) اسلامی مملکت انہی اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتی ہے۔

(3) اس اسلامی مملکت کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جسمانی پرورش اور ان کی ذات کی نشوونما کے سامان و ذرائع فراہم کرے۔

(4) اس کی یعنی انسانی ذات کی نشوونما کی پہچان یہ ہے کہ وہ ان صفاتِ خداوندی کی مظہر ہو جنہیں قرآن "الاسماء الحسنٰی" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی (ان صفات کو چھوڑ کر جو اللہ کی ذات ہی کے لئے مخصوص ہیں) کو بطور معیار سامنے رکھ کر اپنے اندر انسانی ممکنات کو مشہود کئے جانا مقصد دین اور مطلوبِ حیات ہے۔

(5) ایسی اسلامی زندگی کیلئے "اُمّتِ واحدہ" (جس میں کوئی فرقہ نہ ہو) بنیادی شرط ہے اور یہ صرف اسلامی (قرآنی) مملکت میں ممکن ہے۔ یہ خطّۂ ارضی ہم نے ایسی ہی مملکت قائم کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔

پاکستان تو ہم نے حاصل کر لیا لیکن اس اسلامی مملکت کا بدستور انتظار ہے جس کے لئے یہ خطّۂ ارض حاصل کیا تھا! بقول شاعر " وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے"

اس "انتظار" کی بڑی وجہ (بلکہ واحد وجہ) ملّتِ پاکستانیہ میں وحدتِ فکر کا فقدان ہے اور اس کی واحد ذمّہ دار ہے مذہبی پیشوائیت' جو مروّجہ مذہب (یعنی فرقوں والے اسلام) کو دین اللہ بنا کر ملّت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھتی ہے۔ اسے کتاب اللہ کا قانون نہیں بھاتا کیونکہ اس سے اس کی "نمبرداری" خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس لئے اس کی "ازل سے تا امروز" کوشش یہی رہی ہے کہ یہاں اسلام بدستور مذہب کی شکل میں تو باقی رہے' اسلامی نظام (اسلامی مملکت) کی شکل اختیار نہ کر پائے۔

یاد رکھئے کہ جب تک مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی ہے' اللہ کا دین اسلام ہمارے ہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ (قرآنِ حکیم کے الفاظ میں) "اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ انہی کا وجود ہے" (9:34) - اس رکاوٹ کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہمیں اپنے اندر قرآنی اقدار کے لئے تغیّرِ نفس پیدا کرنا ہو گا۔

تغیّرِ نفس

لیکن ہمارے ہاں تغیّرِ نفس کے بغیر تغیّرِ احوال کی کوشش کی جا رہی ہے اور (بدقسمتی سے) اسے "احیاء اسلام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اپنے اندر فکری اور ذہنی تبدیلی لائے بغیر یہ توقع رکھنا کہ ہمارے خارجی حالات بدل جائیں گے' درحقیقت اللہ تعالیٰ کو چیلنج دینے کے مترادف ہے (معاذ اللہ)۔ اللہ کا ارشاد ہے "تغیّرِ نفس کے بغیر تغیّرِ احوال' تم تو ایک طرف' اللہ بھی نہیں کرتا" (8:53)- "یہ اللہ کا اٹل قانون ہے کہ کسی قوم کے خارجی حالات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی جب تک اس کی ذہنیت نہ بدلے' جب تک اس میں فکری' ذہنی اور نفسیاتی تبدیلی نہ ہو" (13:11)- آپ نے غور فرمایا کہ ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ ہمیں اپنی موجودہ روش بدلنی ہو گی - جس دن ہمیں اس حقیقت کا احساس ہو گیا کہ ہمارا موجودہ فرقوں والا اسلام' منزّل من اللہ دین نہیں' بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے' اس دن ہمارے اندر وہ تغیّرِ نفس پیدا ہو جائے گا جس کے بغیر کاروانِ ملّت اپنی صحیح منزل کی طرف رواں دواں نہیں ہو سکتا۔

یاد رہے کہ یہ تغیّرِ نفس صحیح تعلیم و تربیت اور اربابِ اثر و اقتدار کی (خاص طور پر میرِ کارواں کی) سیرت اور کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے چائے کے لئے پانی کی پتیلی چولھے پر رکھیں' لیکن نیچے آگ نہ جلائیں۔

میرِ کارواں کے غور و فکر کیلئے چند گزارشات

قوم میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے اور اس میں اجتماعی زندگی اور مسلم قومیت کا شعور پیدا کرنے کے لئے چند گزارشات' وزیر اعظم کے غور و فکر کے لئے پیش خدمت ہیں :-

1) وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے' قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدّوجُہد کی ضرورت نہیں ہوتی' ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہو۔ لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے اس اہم مقصد سے نہ صرف اغماض برتا بلکہ دین کی تعلیم کو مذہبی پیشوائیت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ آج ہم اپنی اس غفلت کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ ہماری نئی نسلیں ہمارے نظریۂ حیات ____ نظریۂ پاکستان ____ سے ہی بیگانہ ہو رہی ہیں۔ اب اس نظریہ کے تحفّظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کو قوم کا نصب العین حیات قرار دیا جائے۔ اسے نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ پاکستان کا مستقبل مستحکم ہو سکے۔ چونکہ جس اسلامی مملکت کے قیام کے لئے وزیر اعظم کوشاں ہیں اس کی عمارت کی بنیاد اسی نظریۂ حیات پر اٹھتی ہے' اس لئے اس نظریہ کا تحفّظ اور اس کی تعلیم وزیر اعظم کی ذاتی ذمّہ داری ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ مملکت کا شعبۂ تعلیم و تربیت (بشمول دینی تعلیم) وزیر اعظم کی ذاتی نگرانی میں ہو' تاکہ نظریۂ حیات (نظریۂ پاکستان) پر مبنی ایک ایسا نصابِ تعلیم تیار کیا جائے' جو پوری قوم میں وحدت فکر و عمل پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اُمّت کی وحدت کی بنیاد یاد رہے ایک اللہ کے ایک ضابطۂ حیات اور ایک نصاب / ضابطہ تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے۔

2) ملّت میں وحدتِ فکر' قرآنِ حکیم کو قرآن ہی سے سمجھنے سے پیدا ہو گی۔ روایات سے نہیں' جو ہر مذہبی فرقے کی الگ الگ ہیں۔ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ قرآنِ حکیم کے معانی و مفہوم کا ایک ایسا مستند نسخہ حکومت کی نگرانی اور ذمّہ داری میں' تیار کیا جائے جو منجملہ اور باتوں کے' اسلام کے ان بنیادی اور غیر متبدّل اقدار اور اصولوں کو اُجاگر کرے جن پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے اور جو زندگی کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتے ہیں۔ حکومت کا تیار کردہ اور منظور کردہ یہ قرآنی نسخہ تمام چھوٹی بڑی تعلیمی درس گاہوں (بشمول دینی درس گاہوں) ریڈیو' ٹی وی' سرکاری دفاتر اور دیگر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں صحیح قرآنی تعلیم پھیلانے کا واحد ذریعہ ہو گا - قرآنی تعلیم سے مُراد وہ تعلیم نہیں جو ہمارے مدارس میں "دینی علوم" کی شکل میں دی جاتی ہے اور جو طلباء کو قرآن سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔ قرآن کی تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ متعلم

علیٰ وجہ البصیرت یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ بلاشک و شبہ یہ کتابِ عظیم نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانیت کی مشکلات کا حل اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

(3) اسی طرح' قرآنِ حکیم کی روشنی میں' حضور نبیٔ کریمؐ کی حیاتِ طیبہ پر بھی ایک مستند کتاب' حکومت کی نگرانی میں تیار کی جائے' جو منجملہ اور باتوں کے' اس اسلامی نظام پر بھی روشنی ڈالے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا اور جو حضورؐ کے بعد' خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں آگے چلا۔ کیونکہ

"وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی"

ان گزارشات کا واحد مقصد فرقہ پرستی کے رجحان کو ختم کر کے ملّت میں وحدتِ فکر کے فروغ کی حوصلہ افزائی ہے۔ یہ مقصد راتوں رات حاصل نہیں ہو جائے گا۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے میرِ کارواں کو نہایت احتیاط سے پلاننگ کرنا ہو گی کہ مقصد بھی حاصل ہو جائے اور "بھڑوں کا چھتّہ" بھڑکے بھی نہیں! اس کے لئے قرآنی دعوت کا دیا جلانا ہو گا (3:102) اور اس کو دنیاوی اسباب و ذرائع کے تیل سے نہیں بلکہ اپنے خونِ جگر سے جلائے رکھنا ہو گا۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار ! (اقبال)

آخر میں ایک بار پھر سن لیجئے ! ہمارے معاشرہ کا بگاڑ اللہ کی مقدّس کتاب کے ساتھ مسلسل کھیل کھیلنے کی بنا پر ہے۔ اگر ہم نے یہ کھیل بند نہ کیا اور رسولؐ اللہ کی سُنّت کی پیروی نہ کی (ان اتبع الا ما یوحی الی (46:9;10:15;7:203) اور قرآن اور صرف قرآن کو اپنے آئین کی بنیاد نہ بنایا تو پھر فطرت کے فیصلے کا انتظار کیجئے۔ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ جب کوئی قوم مہلت کے وقفہ سے فائدہ نہ اٹھائے اور اپنی ذہنیت نہ بدلے' اپنی روش نہ بدلے تو:-

یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (47 : 38)

"وہ اس قوم کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آیا کرتی ہے' جو اس جیسی نہیں ہوتی"۔

یہی وہ اصولِ خداوندی ہے جس سے ہمیں ڈرنا چاہئے کہ وہ ہمیں مہلت کے وقفے بار بار نہیں دے گا۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے میری بات!